تذکرہ و تبصرہ

بانیٔ تنظیم اسلامی کے دورۂ بھارت کے تأثرات پر

بھارت کے دو دانشوروں کا تبصرہ

اور اس کی جوابی وضاحت خود بانیٔ تنظیم کے قلم سے

راقم الحروف نے اواخرِ نومبر ۲۰۰۴ء سے اواخرِ دسمبر تک بھارت کا ایک ماہ سے زائد عرصے پر محیط دورہ کیا جس میں شمالی اور جنوبی بھارت کے اہم شہروں میں جانا ہوا ـــــ مثلاً شمال میں دہلی اور علی گڑھ ـــــ اور جنوب میں ممبئی، پونا، بنگلور اور حیدرآباد ـــــ پھر واپسی پر راقم نے اپنے تأثرات ایک تقریر کی صورت میں بیان کیے جو مجلّہ ''میثاق'' بابت ماہ فروری ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئے۔ اس پر ایک خط تو بھارت کے معروف سیاست دان اور دانشور اور مسلمانوں کے قومی اور سیاسی رہنما جناب سیّد شہاب الدین صاحب کا موصول ہوا۔ اور دوسرا تبصرہ معروف عالم دین مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ کا ہے، جو براہِ راست ہمیں ارسال نہیں کیا گیا بلکہ ۱۷ر فروری ۲۰۰۵ء کے ''قومی آواز'' میں شائع ہوا۔ جس کا تراشہ ہمیں کسی کرم فرما نے ارسال کر دیا۔

ان میں سے اوّلاً سیّد شہاب الدین صاحب کا خط درج ذیل کیا جا رہا ہے:

''۱۶ر فروری ۲۰۰۵ء

مکرمی و محترمی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تازہ میثاق میں آپ کی تقریر کا متن زیر نظر ہے۔ آپ نے اپنے دورۂ ہندوستان کے مشاہدات اور تأثرات پر روشنی ڈالی ہے۔ مجھے بڑی مسرت ہے کہ ہر جگہ آپ کا شایانِ شان استقبال ہوا اور مسلمانانِ ہند نے گرم جوشی، عقیدت اور محبت سے آپ کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دی۔ آپ نے اخیر میں

اپنی اس رائے کا اعادہ کیا ہے جس کا اظہار آپ نے مجھ سے بذاتِ خود کیا تھا۔ میں معارفِ قرآن (؟) تو نہیں ہوں پر اتنا جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ دونوں حالات میں آزماتا ہے' اقتدار اور محرومی' امارت اور غربت۔ ظاہر ہے کہ متمول اور بااقتدار مسلمان ان سیاسی اور اقتصادی تجربات سے ناآشنا رہتے ہیں جو مقابلتاً غریب اور اقتدار سے محروم مسلمانوں کی زندگی کا فطری معمول بن جاتے ہیں۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اتنا وقت دے کہ آپ اس نشأۃ ثالثہ کو خود سے دیکھیں۔ پر اس کی مجموعی نوعیت کیا ہوگی' یہ کہنا مشکل ہے۔

دو واقعاتی غلطی بتانا مناسب سمجھتا ہوں' جبری نس بندی ۷۵ء سے ۷۷ء کے دوران ہوئی جو ایمرجنسی کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد جتنی حکومتیں آئی ہیں وہ اس بات پر قائم ہیں کہ خاندانی منصوبہ بندی زبردستی نہیں ہوگی۔ اس لیے یہ واقعہ ۷۱ء سے دس پندرہ سال بعد کا نہیں ہے بلکہ پانچ سال بعد کا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ شاہ بانو کے بارے میں سپریم کورٹ کے ۸۵ء کے فیصلے کو رڈ کرنے کے لیے ۸۶ء میں جو قانون بنا اس کا تعلق صرف مسلم مطلقہ کے حقوق سے ہے' پر اگر آپ سپریم کورٹ کے اس کے بعد کے فیصلوں اور بالخصوص حالیہ فیصلوں پر نظر ڈالیں تو ایسے فیصلے ملیں گے جو شریعت سے ٹکراتے ہیں۔ اس کی میرے خیال میں بنیادی وجہ یہ ہے کہ دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح' یا خود ہندوستان کے ہندو کوڈ کی طرح' یہاں کوئی مسلم کوڈ نہیں ہے تو ہر جج بزعمِ خود شریعت کی تشریح پر تل گیا ہے۔ سیاسی سطح پر' آزادی کے بعد ہر حکومت نے اعلان کیا ہے کہ جب تک مسلمان خود نہ چاہیں' مسلم پرسنل لاء میں کوئی قانونی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

اور کئی باتیں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ اوّلاً دعوت آج بھی Defence Mode میں ہے' یعنی مسلمانوں کے درمیان اسلام کو نافذ (؟) کرنا یا مرتدوں کو واپس دائرہ اسلام میں لانا۔ ہندوستان میں بہت کم ہندو مسلمان ہوئے ہیں' اونچی ذات کی تعداد تو صفر کے برابر ہے اور مسلم آبادی کے اضافہ میں تبدیلیٔ مذہب کا دخل برائے نام ہے۔

میں بڑے ادب سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان

سب بنیادی طور پر مذہبی ذہن رکھتے ہیں اور انہوں نے سیکولرزم قبول کیا ہے تو فقط اس معنی میں کہ ریاست کا اپنا کوئی مذہب نہیں اور وہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں برتے گی۔ اس ملک کی مسلمان اقلیت چاہے بھی تو جمہوری دور میں اسلامی حکومت قائم نہیں کر سکتی' لیکن سیکولر حکومت سے اسے برابری مل سکتی ہے۔ اس کا مفاد جمہوریت کے ساتھ سیکولرزم سے وابستہ ہے' اس لیے آپ سیکولرزم کو لغوی معنی اور تاریخی پس منظر سے الگ کر کے سمجھنے کی کوشش کریں۔ نہ وہ کفر ہے' نہ لادینیت' نہ ضدِّ مذہبیت۔

اسلام کی نشأۃِ ثالثہ کا جو نقشہ میرے ذہن میں ہے وہ مذہبی اکثریت سے زیادہ سیاسی اور سماجی امور میں برابری کی شرکت اور علمی اور اقتصادی سربلندی کا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ اگر وہ چاہتا تو سب کو ایک ہی مذہب میں پیدا کرتا' مگر اگر ہماری شرکت سے ہندوستان ایک ایسی موڈل ریاست بنے جہاں سبھی مذاہب کے لوگ برابری اور امن کے ساتھ رہیں اور ہر فرقہ اور طبقے کے لیے ترقی کی راہیں کھل جائیں' جہاں سب کو انصاف ملے اور سب کی حکومت میں شرکت ہو تو یہ بھی نشأۃِ ثانیہ کہا جا سکتا ہے۔ نشأۃِ ثانیہ کا مطلب میری نظر میں مسلم اقتدار بلا شرکت غیرے نہیں ہے۔ ان ممالک میں بھی جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں' ان کو اپنی غیر مسلم اقلیتوں کو شریکِ اقتدار کرنا ہوگا۔ بہرحال آج مسلمان دنیا میں فقط ۱۵ فیصد ہیں۔ وہ پوری دنیا میں اسلام کیسے نافذ کر سکتے ہیں؟ مگر ہر ملک میں اپنے اخلاق و کردار کی بنیاد پر اس کو اسلامی موڈل کے نزدیک لانے میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔

والسلام
آپ کی دعاؤں کا محتاج
شہاب الدین
(سیّد شہاب الدین)

اس مکتوبِ گرامی میں اوّلاً کچھ معلومات ——— اور خصوصاً جبری نس بندی کے زمانے کے ضمن میں میری درج کردہ تاریخ کی تصحیح ہے' جس پر میں سیّد صاحب کا

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq july05\ms14-04 dora-e-baharat.inp 8/22/2014 4:35 PM PAGE 2 (1,1)

ممنون ہوں۔

اس مکتوب کے اصل اور اہم تر موضوع یعنی ''سیکولرزم'' کے بارے میں تو گفتگو بعد میں مولانا قاسمی کے تبصرے کو شامل کر کے ہوگی۔ اس وقت سیّد صاحب نے جو دوبار ''نشأۃِ ثالثہ'' کا تذکرہ کیا ہے اور دو ہی بار ''نشأۃِ ثانیہ'' کی اصطلاح استعمال کی ہے اس پر عرض کرنا ہے کہ اس سے راقم کو اپنے اس نظریئے کی تائید حاصل ہوئی کہ اُمتِ مسلمہ کی ''نشأۃِ اُولیٰ'' تو عربوں کی زیر قیادت ہوئی تھی جو ۱۲۵۸ء میں سقوطِ بغداد کے بعد زوال کی انتہا تک پہنچ گئی اور پھر ''نشأۃِ ثانیہ'' ترکوں کی زیر قیادت ہوئی جو ۱۹۲۴ء میں خلافتِ عثمانی کے خاتمے کے ساتھ زوال کی اس درجہ انتہا کو پہنچی کہ اُس وقت کے لسان العصر اور ملّی شاعر مولانا حالؔی نے فرمایا کہ: ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

لیکن اب اِن شاءاللہ مسلمانوں کی ''نشأۃِ ثالثہ'' کا آغاز ہونے والا ہے ____ (اگرچہ اس سے قبل مسلمانوں کو اپنی بدعملیوں کی مزید شدید اور گھمبیر تر سزا ملے گی!) ____ اس کے برعکس اسلام کی ''نشأۃِ اُولیٰ'' آنحضورﷺ کے دستِ مبارک سے ہوئی جو اپنے عروج کو خلافتِ راشدہ کے دوران پہنچی ____ لیکن خلافت راشدہ کے خاتمے کے ساتھ ہی ''اسلام'' کا زوال شروع ہو گیا جو مسلسل بڑھتا چلا گیا' تا آنکہ آج ''غربت'' کی انتہا کو پہنچ گیا ہے ____ جیسے کہ الصادق والمصدوق محمدﷺ نے پیشین گوئی فرما دی تھی کہ: ''بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ!'' ____ البتہ اب عنقریب اس کی ''نشأۃِ ثانیہ'' ہوگی ____ اور اس کی صورت بالکل وہی ہوگی جو آج سے چودہ سو سال قبل تھی ____ یعنی ازروئے حدیثِ نبویؐ ''خلافت علیٰ منہاج النبوّت'' نہ کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے برابری کے اصول پر co-exist کرنے کی

صورت میں، جیسا کہ سیّد صاحب کا خیال ہے!

رہا سیّد صاحب کا یہ فرمانا کہ ہندوستان کی اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے قبولِ اسلام کا معاملہ صفر کے برابر ہے تو اس کا اصل سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیّد صاحب سیاسی آدمی ہیں، دعوت وتبلیغ اسلام ان کا میدان ہی نہیں ہے، لہٰذا اس معاملے کے ضمن میں صورتِ واقعہ کا ان کے علم میں نہ ہونا قرین قیاس ہے —— اس کے ضمن میں اگر پوچھنا ہے تو پوچھئے مولانا شمس نوید عثمانیؒ کے شاگرد اور خلیفہ سیّد عبداللہ طارق صاحب سے، —— اور مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے فرزند ارجمند اور ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ کے موجودہ مدیر سجاد نعمانی صاحب سے —— اور بدرجہ آخر ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب سے، جو حال ہی میں غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت وتبلیغ کے میدان میں سرگرم عمل ہو گئے ہیں۔ بہرحال اگر سیّد صاحب کی بات درست ہے اور تاحال کسی قابل ذکر تعداد میں ہندوؤں کے مشرف باسلام ہونے کی صورت نہیں بن سکی ہے —— تو ہمیں تو شاہ ولی اللہ دہلویؒ —— جو دوازدہ صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم تھے —— کی پیشین گوئی سے امید ہے کہ ''ایک وقت آئے گا کہ ہندوستان کے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی اکثریت اسلام قبول کر لے گی!'' اور ہماری دعا تو یہی ہے کہ اَللّٰھُمَّ عَجِّلْ لِھٰذَا الْاَمْرِ آمین!!

اس ضمن میں غالباً اس واقعے کے بیان میں کوئی حرج نہیں ہے کہ بھارت کے ایک ارب پتی ہندو حال ہی میں لاہور آ کر اوّلاً میرے ہفتہ وار درسِ قرآن میں شریک ہوئے اور پھر مجھ سے مفصّل ملاقات کے لیے میرے دفتر تشریف لائے جو اسلام تو قبول کر چکے ہیں اور جملہ شعائرِ اسلام کے پابند بھی ہیں لیکن انہوں نے تاحال اس کا اعلانِ عام نہیں کیا، اگرچہ یہ وصیت انہوں نے عدالت سے تصدیق کرا کے محفوظ کرا دی ہے کہ میری اچانک موت پر میری لاش کو جلایا نہ جائے بلکہ مسلمانوں کے طریقے پر دفن کیا جائے۔ انہوں نے اپنی دھرم پتنی کو جب اپنے قبولِ اسلام کی اطلاع دی اور آزادی دی کہ وہ چاہیں تو علیحدگی اختیار کر لیں تو اس پر اُس نے روایتی ہندو عورت کی طرح جو وفادار اور فی الواقع شوہر کی 'داسی' بن کر رہنے والی ہوتی ہے، کہا کہ ''میں آپ

کی چوکھٹ سے داخل ہو چکی ہوں' اب تو اس سے میری ارتھی ہی باہر جائے گی''—— ''البتہ آپ یہ کریں کہ آپ میرے مذہب میں دخل نہ دیں' اور میں آپ کے مذہب اور معمولات پر کوئی اعتراض نہیں کروں گی''۔ چنانچہ ان کی رفاقت تو چل ہی رہی تھی' انہوں نے اپنے مسلمان ہو جانے کی اطلاع کی بنیاد پر ایک مسلمان خاتون سے بھی شادی کر لی جن کی نیکی سے وہ بے حد متاثر ہیں—— لیکن میرے قیام ممبئی کے دوران اس خاتون نے مجھ سے ملاقات کی اور مجھ سے دریافت کیا کہ کیا کسی شخص کا خفیہ طور پر مسلمان ہو جانا دینی اعتبار سے کافی ہے یا اس کا اعلان بھی ضروری ہے—— میں نے جواب دیا کہ اعلان ضروری ہے' اس لیے کہ اسلام کا پہلا رکن ہی نہیں اس میں داخلے کا ''شاہ درہ'' ہی کلمۂ شہادت ہے جو اعلانیہ ادا ہونا چاہیے!—— اس پر ان صاحب سے معلوم ہوا کہ انہوں نے انہیں الٹی میٹم دے دیا ہے کہ یا تو اپنے اسلام کا اعلان کرو ورنہ میرا اور تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا—— چنانچہ اسی مسئلے پر بات کرنے کے لیے وہ میرے پاس آئے تھے اور جب میں نے ان سے کہا کہ اعلان لازمی ہے تو انہوں نے کہا کہ ''مجھے اور تو کسی کی پروا نہیں ہے' صرف اپنی بوڑھی والدہ کے بارے میں ڈر ہے کہ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکیں گی اور شاید ان کی موت واقع ہو جائے'' اس پر جب میں نے یہ کہا کہ ''آپ اس خیال کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیں اور دوسرے میں اس کو کہ آپ کے اعلانِ اسلام سے کتنی تعداد میں اونچی ذات کے ہندوؤں کے اسلام لانے کا راستہ کھلے گا!'' تو اِس پر اُن کے چہرے پر روشنی سی آ گئی اور انہوں نے یہ کہتے ہوئے کہ ''اس پر تو واقعۃً پورے بھارت میں تہلکہ مچ جائے گا'' یہ وعدہ کیا کہ جلد اپنے اسلام کا اعلان کر دیں گے۔ ہماری دعا ہے کہ اَللّٰھُمَّ زِدْ اَمْثَالَہٗ—— اے اللہ ایسی اور بہت سی مثالیں پیدا فرما! آمین!!

اور اب آیئے مولانا سیّد اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ کے تبصرے کی جانب جو درج ذیل ہے:

''سیکولرازم کا مثبت پہلو

سیکولرازم جدید بین الاقوامی جمہوری دور کی سیاسی اصطلاح ہے' اس جدید سیاسی اصطلاح کا ترجمہ قدیم مذہبی لغت میں تلاش کرنا بڑی نادانی کی بات ہے۔

اس سیاسی اصطلاح کا مطلب ومفہوم مذہب میں غیر جانب داری ہے' نہ کسی مذہب کا اقرار ہے' نہ کسی مذہب کا انکار ہے' بلکہ تمام مذاہب کے لیے یکساں سلوک کرنے کا عہد ہے۔

ہمارے بعض مذہبی (خلافتی) رہنما سیکولرازم کو کفر وشرک اور طاغوت اور باطل کے معنی میں لے کر اس نظام کو حکومتِ الٰہیہ اور خلافتِ اسلامیہ کی ضد اور اس کا مدّ مقابل قرار دیتے ہیں' لیکن جب وہ سیکولر نظامِ حکومت میں تمام مذاہب کے ساتھ قانونی طور پر یکساں اور برابر کا سلوک دیکھتے ہیں اور مذہب و مسلک کی خون ریزی سے اور محض جزوی اور فروعی مسائل میں باہمی تصادم کے شرمناک حالات سے خدا کے بندوں کو محفوظ پاتے ہیں تو وہ ایک معقول انسان کے طور پر سیکولرازم کی تعریف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ابھی حال میں پاکستان کے شہرت یافتہ مذہبی اسکالر و خطیب ڈاکٹر اسرار صاحب ہندوستان کا طویل دورہ کر کے اور بڑے بڑے شہروں میں اپنی خصوصی خطابت کے ذریعہ مختلف مسائل پر اظہار خیال کر کے تشریف لے گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے ماہنامہ میثاق (فروری) میں اس دورہ کے تأثرات بڑی تفصیل سے تحریر کیے ہیں اور ہندوستان کے سیکولرازم پر خاص طور پر تبصرہ کیا ہے۔

اس تبصرہ کی خاص بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب بطور ایک قدیم خلافتی قائد کے ایک ہی سانس میں سیکولرازم کو کفر وشرک کے انتہائی مذموم القاب سے یاد کرتے ہیں اور اسی سانس میں ایک معقول انسان کی حیثیت سے ہندوستانی سیکولرازم کے مثبت پہلو کی تعریف کرتے ہیں' منفی پہلو اور مثبت پہلو کی منطقی تقسیم کا سہارا حاصل کر کے زمینی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور اعتراف کرتے

ہیں کہ ہندوستانی سیکولرازم مذہبی خون ریزی سے لوگوں کو محفوظ رکھتا ہے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے ملک پاکستان میں صدر پرویز مشرف صاحب کے ہاتھوں برپا ہونے والے انقلاب کا لحاظ کرتے ہوں اور پاکستانی عوام کو سیکولرازم کا پیغام دیتے ہوں کیونکہ پاکستان مسلکی خونریزی سے لہولہان ہورہا ہے اور اس کا علاج ڈاکٹر صاحب ایک معقول انسان کی حیثیت سے سیکولرازم ہی کے اندر سمجھتے ہوں۔ بہرحال جو مصلحت بھی ہو' اب ڈاکٹر صاحب کے الفاظ پر غور کرو۔

''دراصل سیکولرازم انہوں نے (ہندوستانیوں نے) ذہنی طور پر قبول کرلیا ہے۔ سیکولرازم ہمارے نقطۂ نگاہ سے کفر ہے' لیکن اس کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ تمام مذاہب برابری کی سطح پر آجاتے ہیں۔

یوں سمجھئے کہ ایک بڑا دائرہ ہے' اس دائرہ کے اندر کسی ملک کا سیاسی' معاشی اور معاشرتی نظام ہے اور اس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں' البتہ اس دائرہ کے پورے محیط کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے دائرے بنے ہوئے ہیں' یہ مذاہب کے دائرے ہیں اور ان کو مساوی حیثیت حاصل ہے''۔ (صفحہ ۲۹)

اس دورہ کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہندوستانی حکومت اور ہندوستانی عوام نے جو بہترین سلوک کیا ہے اور ممبئی کے پولیس افسران نے ویزا کے سلسلہ میں جو ہمدردانہ رویہ اپنایا ہے ڈاکٹر صاحب نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ تحریر کیے ہیں کہ دراصل انہوں نے ذہنی طور پر سیکولرازم کو قبول کرلیا ہے' اس لیے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان افسران نے ہمدردانہ سلوک کیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مذکورہ الفاظ میں سیکولرازم کی تعریف کی ہے۔ ہر پڑھا لکھا آدمی جو ہوش وحواس کی سلامتی کے ساتھ موجودہ دور کے اس غیر جانب دار سیاسی نظام کے حالات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرے گا اس کے تأثرات یہی ہوں گے جو ڈاکٹر صاحب نے تحریر کیے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ہندوستانی سیکولرازم کے مثبت پہلو کی تعریف کرتے ہوئے ہندوستان میں قانون کی حکومت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ملک کے بہت

بڑے ہندو مذہبی رہنما شنکر آچاریہ کی قتل کے مقدمہ میں گرفتاری کا تذکرہ بھی کیا ہے اور ہندوستان کے عوام میں ملکی قانون کے لیے جو احترام ہے اس کو تسلیم کیا ہے کہ اس گرفتاری پر ہندو عوام میں کوئی احتجاج پیدا نہیں ہوا۔

تعجب ہوتا ہے کہ سیکولرازم کی اس خوبی (قانون کی عمل داری) کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اس غریب پر کفر و شرک کا فتویٰ لگاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو رحم نہیں آیا۔

ڈاکٹر صاحب سیکولرازم کے مثبت پہلو کی تعریف کرتے ہوئے امریکہ کے صدر مسٹر بش کے حق میں یہ فتویٰ صادر کرتے ہیں' ڈاکٹر صاحب کے الفاظ یہ ہیں: ''چنانچہ جب بش یہ کہتا ہے کہ ہم اسلام کے خلاف نہیں ہیں تو وہ اسلام کو بطور ایک مذہب کے لیتا ہے اور اس سے ان کی واقعتاً کوئی دشمنی نہیں ہے''۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے امریکہ میں مساجد' دینی مدارس' روزہ نماز کی آزادی اور وائٹ ہاؤس میں روزہ افطاری' عید الفطر اور عید الاضحیٰ پر خاص ڈاک ٹکٹوں کے اجراء کا تذکرہ کیا ہے اور پھر یہ الفاظ لکھے ہیں:

''یہ اس سیکولرزم کا مثبت پہلو ہے جو ہندوستان کے اندر جڑوں میں اتر گیا ہے''۔

شاید ہندوستان کے جو علماء کرام صدر امریکہ کے الیکشن کے موقع پر امریکہ دعوت پر امریکہ تشریف لے گئے وہ ڈاکٹر اسرار صاحب کے اس نظریہ کے تحت تشریف لے گئے کہ امریکہ کے صدر مسٹر بش کو اسلام کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے اور امریکہ میں اسلامی ادارے' اسلامی عبادات کی آزادی اور صدر بش کی طرف سے اسلام کی پذیرائی قابل تعریف ہے۔

موصوف ڈاکٹر صاحب ابھی تک امریکہ کے نیو ورلڈ نظام کو صہیونی سازش قرار دیتے رہے ہیں اور اس امریکی مجوزہ نظام کو اسلام کے خلاف ایک عالمی سازش کہتے رہے ہیں' لیکن یہ سیکولرازم کے مثبت پہلو کا کرشمہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی رائے بدل دی اور تبدیلی کی یہ ہوا پاکستان اور ہندوستان دونوں کے اندر علماء کرام کے ایک طبقہ کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔

اس پہلو سے ہندوستان کی تعریف کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان کی شدید مذمت کا بھی ایک پہلو تلاش کر لیا۔ موصوف لکھتے ہیں:

''دوسری طرف پستی کا یہ عالم کہ سوشل سکیورٹی کا کوئی پروگرام ہے ہی نہیں' گویا غریب کا کوئی حصہ کہیں ہے ہی نہیں.....تو اس پہلو سے وہاں پر بہت بڑی پستی کا معاملہ بھی ہے' خاص طور پر بہار اور بنگال کے صوبوں کے مسلمان انتہائی غربت کا شکار ہیں''۔

اس سلسلہ میں بس اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس دورہ میں اپنی تقریروں اور اپنی خطابت کی کامیابی کی دھن میں رہے' شاندار جلسے ہوں' شاندار استقبال ہوں' عربی کے کیو ٹی وی پروگرام اور موصوف کے تنقیدی کیسٹوں کے اثرات کا جائزہ ان پر چھایا رہا۔ اور انہیں ہندوستان کے غریب طبقہ میں آنے والی تبدیلی کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا اور نہ مل سکتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب اگر پیچھے مڑ کر دیکھتے جب ان کا خاندان حصار (ہریانہ) سے ہجرت کر کے پاکستان گیا اس وقت ملک کے غریبوں کی کیا حالت تھی اور آج کیا حالت ہے تو ان کا تبصرہ یہ نہ ہوتا!''

راقم السطور کے نزدیک سیّد شہاب الدین صاحب تو قابل معافی ہیں' اس لیے کہ وہ نہ واقعۃً عالم دین ہیں نہ ہی اس کے مدّعی ہیں ـــــ لیکن مولانا قاسمی صاحب کا معاملہ حددرجہ افسوس ناک ہے کہ عالم دین ہوتے ہوئے اس بات سے صرفِ نظر کر رہے ہیں کہ قرآن کی رو سے ''حاکمیت'' صرف اللہ کے لیے ہے ـــــ ''اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ'' ـــ ''لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ'' ـــ ''لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ؛ ''الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' ـــــ اور ''الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ'' کے ہوتے ہوئے اس معاملے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ بقول اقبال ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری!

چنانچہ اِس دور کا اصل اور سب سے بڑا شرک جسے روایتی علماء نہیں پہچان سکے' یہی ہے

کہ حاکمیت جو کبھی ٹنوں نجاست کی صورت میں فرعونوں اور نمرودوں کے سروں پر رکھی ہوتی تھی آج تولہ تولہ جدید جمہوری ریاست میں تمام شہریوں میں تقسیم کر دی گئی ہے—— تاہم نجاست تو بہرحال نجاست ہے' خواہ ٹن بھر ہو یا تولہ یا ماشہ بھر!—— چنانچہ اُمت مسلمہ کا فرضِ عین ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خلاف اس ''بغاوت'' کو فرو کر کے ''حق بحق دار رسید'' کے مصداق حاکمیت اللہ ہی کو لوٹا دیں—— قرآن حکیم نے تو خیر اس معاملے میں تفصیل اور صراحت کی انتہا کر دی ہے' خود بائبل کی Lord`s Prayer میں یہ تصور بتمام وکمال موجود ہے کہ:

"Thy Kingdome Come!
Thy Will be done on Earth as it is in Heaven!"

یہی وجہ ہے کہ میں نے بھارت کے ہر شہر میں ببانگ دہل کہا کہ سیکولرازم کفر اور شرک ہے—— یہ ضرور ہے کہ اس کے ذریعے ان ملکوں میں مسلمانوں کو کچھ بہتر سلوک مل سکتا ہے جن میں مسلمان اقلیت میں ہوں[1]—— لیکن کیا یہ دُنیوی سہولتیں اور آسائشیں ہی از روئے قرآن و اسلام مسلمانوں کی زندگی کا اصل مقصد ہیں؟ راقم

---

(۱) چنانچہ یہ تاریخی حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ سیکولرازم اصل میں یہودیوں کی ایجاد ہے جو یورپ میں ایک حقیر سی مذہبی اقلیت تھے۔ انہوں نے ہی یہ اصطلاح وضع کی جس کا ثبوت یہ ہے کہ امریکی ڈالر کے بنیادی نوٹ پر (یعنی ایک ڈالر کے نوٹ پر) جسے یہودی بینکرز ہی نے ڈیزائن کیا تھا' ایک جانب اہرام مصر کی تصویر ہے جس کا ظاہر ہے کہ امریکی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے' جبکہ یہودیوں کے لیے یہ ایک بھیانک یاد ہے' اس لیے کہ اس کی تعمیر کے وقت چٹانوں کے گرنے کے باعث لاتعداد یہودی جو غلاموں اور بیگار میں پکڑے جانے والے مزدوروں کی حیثیت سے کام کرتے تھے ان کی پسی ہوئی لاشیں اس کی بنیادوں میں دفن ہیں—— پھر اس پر ایک آنکھ بنائی گئی ہے جو از روئے حدیث نبویؐ دجّال کی ایک آنکھ ہے—— پھر اہرام کے نیچے قوس کی شکل میں یہ عبارت درج ہے: ''ORDOUS NOVUS SECLORUM''، یعنی ''نیا سیکولر نظام''—— چنانچہ اس نئے نظام کے ذریعے ہی یہودیوں کو یورپ اور امریکہ کے ممالک میں مساوی حقوق کے حامل شہری ہونے کی حیثیت حاصل ہوئی۔ جس سے انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اگرچہ بعد میں یہی فوائد ان کے ''طفیل'' مسلمان تارکینِ وطن کو بھی حاصل ہو گئے—— چنانچہ سیکولرزم کا یہ دنیاوی فائدہ مسلّم ہے' اور اس کے ضمن میں میرے اور سیّد صاحب یا قاسمی صاحب کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq july05\ms14-06 dora-e-baharat.inp 8/22/2014 4:35 PM PAGE 6 (1,1)

الحروف تو قلب کی گہرائیوں اور ذہن کی تمام وسعتوں کے ساتھ اس کا قائل ہے کہ بندۂ مؤمن کی زندگی کا **اصل مقصد** تکبیر ربّ، اقامتِ دین، اظہار دین الحق علی الدین کلہ، لیکون الدین کلہ للہ ''لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا' اور قیامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہے ــــــ بقول مولانا نصر اللہ خاں عزیزؒ ؎

''مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی''

بندۂ مؤمن (واضح رہے کہ میں مسلم نہیں کہہ رہا ہوں، رجوع فرمائیں سورۃ الحجرات کی آیات نمبر ۱۴ اور ۱۵ کی جانب!) خواہ کسی حال میں ہو، اقلیت و اکثریت تو کجا، اگر کسی ملک یا بلاد میں یکّہ و تنہا ہو تب بھی اسوۂ رسولؐ کے مطابق دین کی دعوت و تبلیغ اس کا فرضِ اوّلین ہے۔ اور اس دعوت و تبلیغ کا ہدف محض مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ نہیں بلکہ دعوت کے ذریعے ایک مضبوط جماعت (حزب اللہ) تشکیل کرنا اور مناسب قوت حاصل ہو جانے پر اللہ کے دین کی بالادستی کے لیے راست اقدام کی جانب پیش قدمی کرنا ہو!

اب ظاہر ہے کہ اس کٹھن اور پُر صعوبت راہ پر چلنا تو ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے، صرف غیر معمولی ہمت اور عزیمت کے حامل لوگ ہی اس کی جانب کھنچیں گے ــــــ اور اس لائحہ عمل پر باقاعدہ جدوجہد میں شامل ہوں گے ــــــ بقیہ اُمت کا سوادِ اعظم جمہوری اور سیکولر نظام کے فوائد سے بہرہ اندوز ہوتا رہے گا!

ویسے یہ حقیقت بھی ذہن میں رہے کہ بھارت میں سیکولرزم صرف مسلمانوں کی بہبود کے پیشِ نظر اختیار نہیں کیا گیا ــــــ بلکہ یہ خود غیر مسلموں کی سب سے بڑی ضرورت ہے ــــــ اس لیے بھی کہ ان کے پاس کوئی متبادل نظامِ حیات اور دستورِ مملکت ہے ہی نہیں ــــــ اور اس لیے بھی کہ خود اُن کے مابین ذات پات کے عظیم فرق و تفاوت کے علاوہ متضاد عقائد اور مذہبی روایات بھی بجائے خود ایک بہت بڑا مسئلہ ہیں ــــــ لہٰذا سیکولرزم تو ان کی مجبوری ہے ــــــ ویسے بھی ہندو خود مانتے ہیں کہ

ہندومت کوئی ایک مذہب نہیں ہے' بلکہ صرف ایک تہذیب وثقافت (کلچر) کا نام ہے!

رہا سیّد صاحب اور مولانا قاسمی صاحب کا یہ قول کہ سیکولرزم کا مطلب تمام مذاہب کی ''برابری'' ہے تو یہ بات ایک حد تک صحیح ہے ـــــ اور اس میں مذہب کو صرف انفرادی معاملہ قرار دے کر ریاست وسیاست کے میدان سے خارج کر دیا جاتا ہے ـــــ تاہم ایک تو یہ بھی واقعہ ہے کہ جملہ مذاہب کہیں بھی بالکل برابر نہیں ہوتے' بلکہ کسی نہ کسی کو ''سرکاری مذہب'' قرار دیا جاتا ہے ـــــ دوسری جانب اہم تر مسئلہ یہ ہے کہ اسلام ہرگز ہرگز صرف ایک ''مذہب'' اور انسان کا انفرادی معاملہ نہیں ہے' بلکہ یہ اصلاً ''دین'' ہے ـــــ جو انسانوں کی زندگی کے جملہ انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے ـــــ جبکہ سیکولرزم کو ''ہمہ مذہب'' ''لادینیت'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے. اگرچہ یہ ''لادینیت'' بذات خود ایک دین ہے ـــــ یعنی قرآن مجید میں وارد اصطلاحات: ''دین الملک'' (سورۂ یوسفؑ) اور ''دین اللہ'' (سورۂ نصر) کے مقابلے میں ''دین جمہور'' ہے' یعنی وہ نظام جس میں حاکمیت عوام کو حاصل ہوتی ہے. جو بالبداہت دین اللہ یعنی اسلام کی نفی ہے' از روئے آیات قرآنی: ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ﴾ اور: ﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ﴾ (سورۂ آل عمران: آیات ۱۹' ۸۵)۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ امریکہ اور اس کا حاشیہ بردار پورا مسیحی یورپ جب یہ کہتا ہے کہ ہم اسلام کے دشمن نہیں ہیں تو ایک اعتبار سے ان کی بات صحیح ہے ـــــ اس لیے کہ وہ سیکولرزم کے اصول کے تحت اسلام کو بحیثیت ''مذہب'' سینے سے لگانے کے لیے پوری طرح آمادہ ہیں ـــــ البتہ جہاں تک اسلام بحیثیت دین کا تعلق ہے' اس کے خلاف ان کا کھلا اعلانِ جنگ ہے ـــــ اس لیے کہ ایسے مسلمانوں کو جو اسلام کو محض مذہب نہیں دین سمجھتے ہیں وہ ''بنیاد پرست'' (Fundamentalists) قرار دیتے ہیں جن کے خلاف ایک عالمی سرد جنگ (Cold War) شروع ہو چکی ہے ـــــ جو گاہے گاہے ''گرم'' بھی ہو جاتی ہے' جیسے کہ افغانستان میں ہوئی! (عراق کا معاملہ دوسرا ہے' وہاں کوئی فنڈامنٹلزم تھا' نہ

بڑے پیمانے پر تباہی لانے والے ہتھیار تھے اور نہ ہی صدام کا کوئی تعلق ''القاعدہ'' سے تھا—— عراق پر فوج کشی اصل میں ''عظیم تر اسرائیل'' کی جانب پہلا قدم ہے۔ چنانچہ عراق پر امریکی حملے کی کامیابی کے وقت ایریل شیرون' وزیراعظم اسرائیل نے برملا کہہ دیا تھا کہ ''عنقریب عراق پر ہمارا قبضہ ہوگا!''——

بہرحال سیکولرزم دینِ اسلام کی ضد ہے—— اور پورے عالمِ اسلام کو مشرف بہ سیکولر جمہوریت کرنے کا جو ارادہ اعلانیہ ظاہر کیا جا رہا ہے وہ اصل میں—— دین اسلام کی بیخ کنی کرنے کا پروگرام ہے—— اب مستقبل میں ہوگا کیا؟ یہ قطعی اور حتمی طور پر تو فی الحال صرف اللہ ہی کے علم میں ہے—— لیکن نبی اکرم ﷺ کی پیشین گوئیوں کے مطابق مسلمان بالخصوص عربوں کو اُن کی بے عملی ہی نہیں بدعملی کی بھرپور سزا دینے کے بعد نصرتِ الٰہی کے ذریعے آخری فتح مسلمانوں ہی کو حاصل ہوگی—— اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام پورے کرۂ ارضی پر قائم و نافذ ہو کر رہے گا۔ اِن شاء اللہ العزیز!

آخر میں مولانا قاسمی مدظلہٗ اور دوسرے علماء کرام سے گزارش ہے کہ وہ اس کیفیت سے باہر نکلنے کی کوشش کریں جو خلافت راشدہ کے خاتمے کے بعد سیاست و حکومت کی بلندترین سطح سے اسلام کی بے دخلی سے شروع ہوئی تھی—— اور پھر جب اسلام اور مسلمان دونوں دورِ زوال کی انتہا کو پہنچ گئے تو پھر یورپی امپیریلزم اور نوآبادیاتی (Colonial) حکومتوں کے قیام کے بعد حکومت کی سربراہی بھی مسلمانوں سے چھن گئی—— اور عدل و قضا کے معاملات بھی علماء کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ اور اسلام ؎ ''بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب—— اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی'' کے مصداق دَورِ غلامی میں صرف ایک ''مذہب'' بن کر رہ گیا اور اسلام کا یہ تصور ایک امر مبرم (Fait Accompali) کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا—— اور نہایت افسوس کی بات ہے کہ علماء کرام کی عظیم اکثریت تا حال اسلام کے اسی محدود تصور کو سینے سے لگائے اور حرزِ جان بنائے ہوئے ہے!——

مولانا قاسمی مدظلہٗ کی مزید چند چھوٹی چھوٹی باتوں کی بھی وضاحت ہو جائے تو مناسب رہے گا:

۱۔ بھارتی سیکولرزم ''خون ریزی'' کو تا حال بالکل نہیں روک سکا۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد جو قتل عام خصوصاً ممبئی میں ہوا تھا اسے یاد کیجیے ـــــ اور وہ اگر ذرا پرانی بات ہوگئی ہے تو ماضی قریب میں گجرات میں مسلمانوں کے قتل عام کو یاد کیجیے!

۲۔ میرا سیکولرزم سے کوئی ہمدردانہ رویّہ ہرگز نہیں ہے۔ میں اسے کفر اور شرک سمجھتا ہوں' البتہ اس کے ایک پہلو کو اقلیتوں کے حق میں مثبت قرار دیتا ہوں ـــــ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ سیکولرزم سراپا خیر ہے' غلط ہے' جیسے کہ ایک کافر انسان بھی طبعاً شریف اور خادمِ خلق ہوسکتا ہے ـــــ اسی طرح کا معاملہ یہ ہے۔

۳۔ میں نے سیکولرزم کے بارے میں اپنی رائے ہرگز نہیں بدلی ـــــ عملاً پاکستان میں بھی تا حال انگریزی دَور کے سیکولرزم ہی کا بول بالا ہے ـــــ اور یہاں مذہبی ''خونریزی'' اگرچہ اصلاً تو بھارتی ''را'' اور اسرائیلی ''موساد'' کی کرم فرمائی ہے ـــــ تاہم اگر کوئی مذہبی عنصر اِس میں شامل ہے بھی تو مسلم اور غیر مسلم کا نہیں' مسلمانوں کے اپنے فرقوں کا ہے!

۴۔ مولانا نے میری جائے پیدائش حصار کا ذکر کچھ ایسے انداز میں کیا ہے کہ گویا آزادی سے قبل وہاں مسلمان اچھوتوں اور ہندوؤں کے غلاموں کی حیثیت سے اور مفلوک الحالی کے حال سے دوچار تھے ـــــ ایسا ہرگز نہیں ہے ـــــ حصار میں ہر بقرعید پر تو ہندو مسلم فساد کا ہونا ایک امر قطعی تھا' اس لیے کہ ہندوؤں کی گئو ماتا کو اعلانیہ اور ہندوؤں کو دکھا کر ذبح کیا جاتا تھا ـــــ تاہم ان فسادات میں پلڑا مسلمانوں ہی کا بھاری رہتا تھا ـــــ اور مسلمان مالی اعتبار سے ہندوؤں کے ہم پلہ تو نہیں تھے لیکن بجائے خود باعزت روزی کما کر بالعموم متوسط درجہ کی مالیاتی زندگی گزارتے تھے ـــــ البتہ ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا وہ ایک علیحدہ اور ہندوستان گیر مسئلہ تھا ـــــ اور اُس وقت بھی خاص طور پر شہر حصار میں مسلمانوں کا جانی نقصان نہ ہونے کے برابر ہوا ـــــ شہر

مسلمانوں سے خالی بھی مقامی ہندوؤں نے نہیں بھارتی فوج نے کرایا——

(۲)

حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ کی ایک اور ''کرم فرمائی'' حال ہی میں سامنے آئی ہے۔یعنی مولانا کی وہ تحریر جو''ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے تفسیری کیسٹوں میں لفظ جہاد کا بے محل استعمال'' کے عنوان سے دارالعلوم دیوبند کے ماہنامہ مجلّے بابت مئی ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی ہے۔(بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تحریر اس سے قبل پندرہ روزہ ''وحدت نو'' بابت جولائی ۲۰۰۴ء میں بھی شائع ہو چکی ہے——اس پر حیرت ہوئی کہ اس کے بعد تو اواخرِ نومبر اور اواخرِ دسمبر ۲۰۰۴ء میں مَیں نے دو مرتبہ مولانا سے بالمشافہ ملاقات کی تھی——وہاں اس کا تذکرہ کیوں نہ آیا——شاید کہ اکرامِ ضیف مانع ہوا ہو——لیکن احقاقِ حق اور ابطالِ باطل میں اس قسم کی سوچ کو مانع نہیں ہونا چاہیے!)

مولانا کی یہ تحریر خاصی طویل ہے——(یعنی بڑے سائز کے سات صفحات پر مشتمل) لہٰذا اسے پورا نقل کرنا تو ممکن نہیں ہے، تاہم چند باتیں مختصراً پیش خدمت ہیں:

۱۔آنحضورﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مکی دَور بلاشبہ جہاد کا دَور ہے——اور مدنی دَور جنگ اور قتال کا دَور ہے (جو مولانا کے قول کے مطابق غزوۂ بدر سے نہیں شروع ہوا بلکہ ہجرت کے چھ ماہ بعد ہی شروع ہو گیا تھا جب آنحضورﷺ نے قریش کے تجارتی قافلوں کے راستوں کو مخدوش بنانے کے لیے چھاپہ مار دستے بھیجنے شروع کر دیے تھے——یہ مہمیں کل آٹھ تھیں جن میں سے چار میں آنحضورﷺ بھی شریک ہوئے تھے، جنہیں غزوات، قبل از غزوۂ بدر، قرار دیا جاتا ہے)۔

۲۔مولانا کا یہ فرمانا کہ:''ڈاکٹر صاحب اپنی اس خود ساختہ تشریح میں جہاد کے لفظ کو اس کے لغوی مفہوم (جدوجہد) میں لیتے ہیں.....''اس لیے غلط بیانی ہے کہ میں ''جہد'' کو تو واقعتاً کوشش (انگریزی میں To strive for something) کے معنی میں لیتا ہوں لیکن جہاد کا مفہوم اس کے بابِ مفاعلہ سے ہونے کے ناتے فارسی

لفظ ''کشاکش'' کا لیتا ہوں جسے انگریزی میں "To struggle against something" کے الفاظ سے ادا کیا جائے گا۔

۳۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں: ''(مکی سورتوں میں) دو جگہ جہاد کا لفظ (استعمال) ہوا ہے—— پہلی آیت سورۂ فرقان کی ہے''—— (اس کے بعد ایک لمبی اور بے محل عبارت درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:) ''﴿وَجٰهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾—— ''اور مقابلہ کر اُن کا اِس (قرآن) کے ذریعے بڑے زور سے''۔ شاہ صاحب (شاہ عبدالقادرؒ) بلاغت کی ایک قسم یعنی تنوّعِ معانی اور مفہوم میں رنگا رنگی پیدا کرنے کے امام ہیں۔ چنانچہ آپؒ نے پہلے لفظ جہاد کا ترجمہ مقابلہ تحریر کیا اور وہی لفظ مفعول مطلق کی صورت میں آیا تو اس کا ترجمہ زور (طاقت) سے کیا—— ''یہاں اپنا سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے کہ ''طاقت کے ساتھ مقابلہ'' اور ''جہاد'' میں کیا فرق ہے؟ مولانا ٹھیک فرماتے ہیں کہ نبوت و رسالت کے بنیادی فرائض تذکیر، انذار، تبشیر، وعظ، نصیحت، تبلیغ اور تعلیم و تبیین ہی ہیں—— لیکن اوّل تو یہ سارے کام کسی خلا میں نہیں ہوتے، ایک ایسے ماحول میں ہوتے ہیں جہاں دعوتِ اسلامی کے مخالف اور متضاد نظریات و عقائد اور اعمال و رسومات موجود ہوتے ہیں، چنانچہ ان فرائض کی ادائیگی میں ''مقابلہ'' اور ''کشاکش'' کی صورت حال لازماً پیدا ہوتی ہے اور اسی کا نام ''جہاد'' ہے۔

۴۔ مولانا فرماتے ہیں: ''(دوسری آیت جس میں جہاد کا لفظ کسی مکی سورت میں آیا ہے وہ ہے:) ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾—— جن لوگوں نے خدا کی راہ میں محنت کی ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیں گے—— عنکبوت کی (اس) آیت میں بڑے شاہ صاحب شاہ ولی اللہ صاحب نے جہاد کے لفظ کا ترجمہ جہاد ہی سے کیا ہے، مگر شاہ رفیع الدینؒ نے والد کی پیروی نہیں کی، کیونکہ مکی دَور میں جہاد (اپنے مشہور معنی میں) موجود نہیں تھا!''

اب حیرت ہے کہ اسے مولانا کی پیرانہ سالی اور قرآن کے اٹل قوانین: ﴿وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ﴾ اور ﴿لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا﴾ کے مطابق زوالِ

فہم وعقل کے علاوہ اور کس بات سے تعبیر کیا جائے کہ پوری سورت عنکبوت خصوصاً اس کا پہلا اور اہم ترین رکوع ایمان واسلام اور کفر وشرک کے مابین ''کشاکش'' اور اس سے پیدا شدہ ابتلاء اور آزمائش اور اس کے ضمن میں صبر ومصابرت کے مباحث پر مشتمل ہے' چنانچہ ایک جانب مصائب پر کسی قدر پریشانی کا اظہار کرنے والے صحابہ رضوان اللہ علیہم کو فہمائش کی گئی ہے—— کہ ﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ﴾——اور ﴿وَمَنْ جَاھَدَ فَاِنَّمَا یُجَاھِدُ لِنَفْسِہٖ﴾ اور دوسری جانب نوجوان مسلمانوں پر ان کے مشرک والدین کی مخالفت اور ان پر دباؤ ڈالنے کو بھی مشرکوں کے جہاد ہی سے تعبیر کیا گیا ہے' یعنی: ﴿وَاِنْ جَاھَدٰکَ عَلٰی اَنْ تُشْرِکَ مَالَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ﴾—— گویا یہ دوطرفہ کشاکش تھی اور رُودررُو مقابلہ یعنی جہاد و مجاہدہ تھا——اس پر بھی لفظ جہاد کے اطلاق کو غلط قرار دینا—— ع ''بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است!'' کے سوا اور کیا قرار دیا جائے۔

۵۔ اپنی تحریر میں مولانا نے کمال چابکدستی کے ساتھ نبی اکرم ﷺ پر نبوت اور رسالت کی تکمیل کے مظہر اَتم یعنی نبوت ورسالت کے بنیادی مقاصد پر مستزاد ''اظہار دین الحق علی الدین کلہ'' کے الفاظ کو نظر انداز کیا ہے جو نبی اکرم ﷺ کی شان اور بعثتِ محمدیؐ کے مقصد کے بیان میں قرآن میں تین بار وارد ہوئے (سورۃ التوبہ آیت ۳۳' سورۃ الفتح آیت ۲۸ اور سورۃ الصّف آیت ۹) ہیں اور کسی دوسرے نبی یا رسول کے لیے ایک بار بھی استعمال نہیں ہوئے——اور خصوصاً محقق قرآن ہونے کے باوجود سورۃ الصّف کے اس وصف کی جانب بھی توجہ نہیں فرمائی کہ مقصد بعثت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بیان کے فوراً بعد عذابِ جہنم سے رستگاری کی شرطِ لازم کے طور پر تو ''جہاد فی سبیل اللہ'' کو بیان کیا ہے (آیات ۱۰ و ۱۱) لیکن اس خاص مقصد بعثت کے آخری اور لازمی تقاضے یعنی اللہ کی راہ میں جنگ یعنی ''قتال فی سبیل اللہ'' کو محبوبیتِ خداوندی کے مقام گویا انسان کی روحانی ترقی کی بلند ترین منزل قرار دیا ہے—— یہ سورۂ مبارکہ اس اعتبار سے بہت خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ اس چھوٹی سی سورت میں جہاد فی سبیل اللہ

اور قتال فی سبیل اللہ دونوں اصطلاحات گویا فوری تقابل یعنی (simultaneous contrast) کے طور پر وارد ہوئی ہیں۔

۶۔ مولانا کو لفظ جہاد سے جو وحشت محسوس ہو رہی ہے وہ اس بنا پر ہے کہ اغیار اور اعداء نے نبی اکرم ﷺ کے مشن کی تکمیل کے ضمن میں جہاد اور قتال کے مبالغہ آمیز ذکر کے ذریعے یہ پراپیگنڈہ کیا کہ ع ''بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!'' لیکن مولانا اگر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں تو صاف نظر آ جائے گا کہ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ علماء کرام نے جہاد کو بھی ہر مقام پر جنگ ہی کے معنی میں استعمال کیا۔ اس تأثر میں کسی قدر کمی ہو سکتی ہے تو صرف اس طور سے کہ قتال فی سبیل اللہ کو تو لازماً اور لامحالہ اللہ کی راہ میں جنگ ہی سے تعبیر کیا جائے —— لیکن جہاد ہر جگہ جنگ کے معنی میں مدنی سورتوں میں بھی نہیں۔ جس کی سب سے بڑی مثال سورۃ التوبہ اور سورۃ التحریم میں وارد یہ آیت مبارکہ ہے کہ : ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ﴾ جبکہ منافقین کے خلاف قتال یا جنگ سیرتِ مطہرہ سے ہرگز ثابت نہیں ہے۔ اور کمال ستم ظریفی ہے کہ میری اس کوشش کی تغلیط کے ذریعے مولانا اور ان کے حلقے کے لوگ (جنہوں نے مولانا کا یہ مقالہ شائع کیا ہے) قرآن کے ''خونی کتاب'' (لائڈ جارج۔ وزیر اعظم برطانیہ) اور اسلام کے ایک پُرتشدد مذہب ہونے کے تصور کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔

۷۔ مولانا کا ایک مزید شاہکار ان کا یہ جملہ ہے ——: ''رسول پاک کو جو مشن دیا گیا وہ محبت سے دین کو غالب کرنے کا تھا۔ وہ مشن آپؐ نے پورا کیا۔ میدانِ جہاد میں ہلاک ہونے والے چند بدقسمت افراد تھے.....!!'' ایک بار پھر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ؎ ''ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے! خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے!'' گویا غزواتِ بدر، اُحد، احزاب، وغیرہ وغیرہ ''محبت'' کے ساتھ لڑی گئی تھیں! —— اور ایک ہزار کے لگ بھگ کافر اور مشرک جو ہلاک ہوئے وہ تو ''چند بدقسمت افراد'' تھے ہی —— جو ڈھائی سو سے زائد مسلمان شہید ہوئے وہ بھی معاذ اللہ ثم معاذ اللہ، نقل کفر

کفر نہ باشد'' ''بدقسمت'' تھے ـــــ اسی طرح اوپر درج شدہ حکم ''وَاغۡلُظۡ عَلَیۡھِمۡ'' بھی آنحضورﷺ کو نہیں تھا کسی اور کو تھا ـــــ اب اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ ؎
''خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں۔ ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بےتوفیق!''

۸۔ آخری ـــــ اور شاہکار ترین قول یہ ہے (جس پر مولانا کا وقیع مقالہ اختتام پذیر ہوتا ہے:) ''غزواتِ رسول کی عظمت اپنی جگہ ہے اس سے انکار کون کرسکتا ہے؟ مگر ان کا تعلق دعوتِ حق سے قائم کرنا درست نہیں!'' مولانا فرمائیں کہ ان کا تعلق دعوتِ حق سے نہیں تھا تو پھر کس چیز سے تھا؟ کیا ''مالِ غنیمت اور کشور کشائی'' سے تھا؟ تاہم مولانا کی بات اس درجہ صحیح بھی ہوسکتی ہے کہ غزوات کا تعلق دعوتِ دین سے بڑھ کر اقامتِ دین' تکبیر ربّ' قیامِ حکومتِ الٰہیہ' اعلائے کلمۃ اللہ' اظہار دین الحق علی الدین کلہ اور ''لیکون الدین کلہ للہ'' سے تھا جس سے فقیہانِ حرم ذہناً نابلد اور عملاً محترز اور دستکش ہوچکے ہیں ـــــ فقط!

(۳)

> ہم نے پہلے تو یہ لکھا تھا کہ مولانا کی یہ شاہکار تحریر پوری شائع نہیں کی جارہی ہے۔ لیکن بعد میں خیال ہوا کہ اسے شائع کر ہی دیا جائے' تاکہ قارئین ''میثاق'' بھی جوابی تبصرے سے کما حقہ' محظوظ ہوسکیں ـــــ اور اللہ کرے کہ دارالعلوم دیوبند کے ماہنامہ ترجمان کے ذمہ دار حضرات بھی غور کریں کہ ایسی بے ربط تحریر کو شائع کر کے انہوں نے نہ اسلام کی کوئی خدمت کی ہے نہ خود دارالعلوم کی۔ دارالعلوم دیوبند اِس وقت تو جس حیثیت میں ہے وہ علیحدہ بات ہے لیکن اس کی شاندار روایات کے پیش نظر اس تحریر کی اشاعت محلِ نظر ہے۔

''پاکستان کے مشہور مترجم قرآن ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنے تفسیری کیسٹوں میں اپنے ذاتی تحقیقی اجتہادات اور خود ساختہ فلسفیانہ عقلی نکتوں سے کام لے کر تفسیر قرآن کو جمہور اہل تفسیر کے مفہوم و مطلب کے دائرہ سے دور لے جانے کی جو کوشش کرتے ہیں اور اس عقلی جدت کو موصوف قرآن کریم کی

تفسیر کا اونچا فہم وفکر قرار دیتے ہیں اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب تاریخ نبوت اور رسول پاک ﷺ کی حیاتِ پاک کے مکی دور (تیرہ سالہ عہد) کے بارے میں یہ فرماتے ہیں اور اپنی کتابوں میں یہ تحریر کرتے ہیں کہ تیرہ سالہ مکی دور جہاد کا دور ہے اور مدنی دور جو غزوۂ بدر سے شروع ہوتا ہے وہ دور قتال ہے، یعنی غزواتِ رسول کا دور قتل وقتال کا دَور ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنی اس خود ساختہ تشریح میں جہاد کے لفظ کو اس کے لغوی مفہوم (جدوجہد) میں لیتے ہیں اور اپنی تشریح کو اعتراض سے بچانے کے لیے یہ تاویل کرتے ہیں کہ جہاد کا لفظ اپنے شرعی اصطلاحی مفہوم میں نہیں ہے بلکہ لغوی مفہوم میں ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اس بات پر اصرار کیوں ہے کہ وہ تیرہ سالہ مکی دور کے لیے دورِ جہاد کی تعبیر اختیار کریں، جبکہ قرآن کریم اس دور کے لیے جو الفاظ استعمال کرتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

انذار، تنذیر، تبلیغ ودعوت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، شہادت علی الناس، اور رسول پاک ﷺ کے لیے بھی انہی الفاظ کی صفات اختیار کرتا ہے۔

قرآن کریم نے مدنی دور کے لیے مدنی سورتوں میں جہاد کا استعمال شروع کیا ہے، اب اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:

.....

.....

دو مقام پر جہاد کا لفظ ہے:

مکی سورتوں میں دو جگہ قرآن نے جہاد کا لفظ لغوی مفہوم (جدوجہد) میں استعمال کیا ہے اور دونوں جگہ امام المفسرین شاہ عبدالقادر صاحب اور ان کے بھائی شاہ رفیع الدین صاحب نے جہاد کے لفظ کا لغوی ترجمہ کیا ہے۔

پہلی آیت سورہ فرقان کی ہے، سورۃ الفرقان مکی ہے۔ حضور ﷺ نے صفاء پہاڑی پر کھڑے ہو کر عرب کے قدیم طریقہ کے مطابق اعلان کیا: ''انا النذیر العریان'' لوگو! میں کھلا خبردار کرنے والا ہوں، میری بات سنو! کسی بڑے خطرہ سے ہوشیار کرنے کے لیے اپنے جسم سے کپڑے اتار کر

اعلان کرنے والا اعلان کرتا تھا اور لوگ اس غیر معمولی حالت کو دیکھ کر اس کے اعلان پر توجہ دیتے تھے' یہ طریقہ کسی دشمن کے حملہ کے خطرہ سے آگاہ کرتا تھا۔

تبلیغ عام کا حکم:

اس خاص دعوت کے بعد پھر دعوت عام کا حکم نازل ہوا اور کہا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (المائدۃ:۶۷) ''اے رسول! جو پیغام (توحید ونبوت) تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اسے عام لوگوں تک پہنچاؤ''۔

دعوت الی اللہ کا حکم:

سورہ نحل مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی' اس سورۃ میں دعوت الی اللہ کا لفظ استعمال کر کے دعوت الی اللہ کے آداب واضح کئے گئے اور فرمایا: ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ (نحل:۱۲۵) ''اے رسول! تم اپنے پروردگار کی راہِ حق کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور اس میں حکمت ودانش اور بااثر وعظ ونصیحت اور نہایت سنجیدہ وبحث مباحثہ کی پابندی کرو''۔

سورہ احزاب (۴۶) میں رسول اکرم ﷺ کو دعوت کی صفت سے موصوف کر کے داعی الی اللہ کے خطاب سے نوازا گیا۔

﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۝﴾ ہم نے اے رسولِ محترم! تم کو دین حق کی گواہی (قولی اور عملی) دینے والا' خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور دعوت حق دینے والا بنا کر بھیجا ہے اور آپ ایک روشن چراغ ہیں ان تمام صفات کے اندر۔ ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِیْرًا﴾ (۵۲) ''اور مقابلہ کر ان کا اِس (قرآن) کے ساتھ بڑے زور سے''۔

شاہ صاحب (شاہ عبدالقادر) بلاغت کی ایک قسم یعنی تنوعِ معانی اور مفہوم میں رنگا رنگی پیدا کرنے کے امام ہیں۔ چنانچہ آپ نے پہلے لفظ جہاد کا ترجمہ ''مقابلہ کر'' تحریر کیا اور وہی لفظ مفعول مطلق کی صورت میں آیا تو اس کا

ترجمہ زور (طاقت) سے کیا۔

سورہ عنکبوت مکی ہے' اس میں کہا گیا: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (۶۹) جن لوگوں نے خدا کی راہ میں محنت کی ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیں گے۔ جہاد کے لفظ کا لغوی مفہوم مقابلہ کرنا اور زور کے ساتھ کرنا اور محنت کرنا دونوں ترجمہ بہت اچھے ہیں۔

عنکبوت کی آیت میں بڑے شاہ صاحب شاہ ولی اللہؒ نے جہاد کے لفظ کا ترجمہ جہاد ہی کے لفظ سے کیا ہے' مگر شاہ رفیع الدین صاحب نے اپنے والد کی پیروی نہیں کی کیونکہ مکی دور میں جہاد (اپنے مشہور معنی میں) موجود نہیں تھا' اور آیت مذکورہ میں وہ مشہور معنی مراد نہیں ہیں۔

اسلام دین دعوت ہے:

اسلام کے پہلے بنیادی دور (دور مکہ تیرہ سال) کو قرآن کریم نے دورِ دعوت کے طور پر متعارف کیا ہے' دور اسلام کو ایک علمی مذہب قرار دے کر اسے حیاتِ انسانی کا فطری دین قرار دیا ہے۔

قرآن کریم نے اسی بنیاد پر اسلام کے بارے میں یہ کہا ہے کہ یہ مذہبِ فطرت عقل سلیم کو مطمئن کر دیتا ہے اور اس کے پھیلانے کے لیے زور و زبردستی کی اجازت نہیں ہے۔ زور زبردستی غیر فطری اور اوہام زدہ مذاہب کے لیے کی جاتی ہے۔ مرزا غالبؔ نے تقریر دل پذیر کی تعریف میں کہا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کو جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ یہ بھی میرے دل میں تھا

تقریر کی لذت سے آپ دین حق اسلام کی صحیح تبلیغ مراد لیجیے۔

رسول پاک کا مشن

موقعہ بے موقعہ اسلام کے تعارف و تاریخ میں لفظ جہاد کو استعمال کرنے والے اس حقیقت سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں کہ قرآن کریم نے رسول پاک ﷺ کا مشن یہ قرار دیا ہے کہ آپ محبت اور دلسوزی سے دین توحید کی اشاعت فرمائیں۔ سورۂ فصلت (۳۴) میں کہا گیا: ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq july05\ms14-06 dora-e-baharat.inp 8/22/2014 4:36 PM PAGE 12 (1,1)

وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَبَیۡنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ○﴾ (فصلت) اے رسول محترم! برائی اور بھلائی دونوں یکساں نہیں، تم برائی کے جواب میں اس سے زیادہ بھلائی کیا کرو، اس کا نتیجہ تمہارے حق میں یہ ہوگا کہ تمہارے دشمن دوست بن جائیں گے۔

حضورﷺ نے قرآن کی اس ہدایت پر عمل کیا اور پھر خدا کا وعدہ اپنی صداقت کے ساتھ ظاہر ہوا کہ آپؐ کے دشمن آہستہ آہستہ آپؐ کے دوست اور مومن صادق بن گئے۔ وہ مٹھی بھر دشمن جو اپنی فطرت کی سلامتی کو اپنی ہٹ دھرمی سے برباد کر چکے تھے وہ میدانِ جہاد (عذاب) میں ہلاک کر دیے گئے۔

رسول آخرالزماں سے پہلے یہ ہوا کہ حضرات انبیاء کرام نے دعوت و توحید شروع کی اور ان کی قوموں نے ظلم وستم برپا کیا اور چند نفوس کے علاوہ ان کی قومیں اپنی مسلسل سرکشی کے سبب مختلف قسم کے عذابوں میں ہلاک کر دی گئیں۔

رسول پاک کو جو مشن دیا گیا وہ محبت سے دین کو غالب کرنے کا تھا، وہ مشن آپ نے پورا کیا۔ میدان جہاد میں ہلاک ہونے والے چند بدقسمت افراد تھے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کا اپنے تفسیری بیانات میں مستقل طور پر یہ نظریہ نشر ہوتا ہے کہ رسول پاکﷺ بدر کے یوم الفرقان میں فتح مند ہوئے، لیکن قرآن کہتا ہے کہ حضورﷺ کو اپنے مشن (محبت و دعوت) کی راہ پر ہر قدم پر فتح حاصل ہوئی، کیونکہ خدا کا وعدہ آپ سے (آیت فصلت میں) یہی تھا۔

بدر و اُحد کی سیاسی اور فوجی فتوحات کا (تعلق) رسول پاکﷺ اور آپؐ کے رفقاء کی جماعت کی سیاسی فتح مندی اور سیاسی غلبہ سے تھا، اسی لیے شاہ عبدالقادر صاحب نے یوم الفرقان کا ترجمہ فیصلہ کا دن تحریر کیا، جبکہ دوسرے مترجم حضرات نے امتیاز اور فتح کے الفاظ تحریر کئے ہیں۔

فرقان دفاعی فیصلہ:

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب یوم الفرقان کو حضور علیہ السلام کی مطلق فتح مندی کا دن کہتے ہیں، یعنی حضورﷺ اس سے پہلے غیر فاتح (ناکام) رہے۔ لیکن

حضرت شاہ ولی اللہ نے علوم نبوت کے مباحث میں یہ تحریر کیا ہے کہ اسلام پہلے دن سے مذہب فاتح تھا اور اس کی بنیاد دو علمی معجزے تھے: ایک قرآن کریم' جس کے علمی چیلنج کا مخالفین کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ قرآن نے چیلنج کیا: ﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ (بقرۃ) اے قریش! تم قرآن کریم کی ایک سورۃ جیسی سورہ بنالاؤ' مگر قریش اس تحدّی کے جواب سے عاجز رہے۔

رسول پاک ﷺ کی نبوتِ صادقہ بھی ایک علمی معجزہ تھا' ایک اُمی لقب شخص نے چیلنج کیا: ﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِيْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (یونس) اے قریش! میں نے تم میں اپنی عمر کا بڑا حصہ گزارا ہے۔ تو کیا ایک اُمّی کا علومِ نبوۃ کے اتنے عظیم و بے مثال ذخیرہ کا حامل ہونا' علمی معجزہ نہیں؟ میرا اُمّی ہونا تم پر عیاں ہے اور پھر میری علمی عظمت بھی تم پر عیاں ہو رہی ہے۔

پس اسلام پہلے دن سے فاتح تھا' البتہ وہ فتح اقدامی تھی اور بدر کے دن میدان جہاد میں حضور ﷺ کو دفاعی فتح حاصل ہوئی' جسے سیاسی فتح بھی کہا جا سکتا ہے۔

چنانچہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کا داخلہ ایک فاتح کا داخلہ تھا اور آپؐ نے ایک فاتح کی حیثیت سے مدینہ منورہ کی امارت کا منصب سنبھالا۔

حضور ﷺ کی امارت متفقہ تھی' مسلم اکثریت اور یہودی اقلیت دونوں کے آپؐ متفقہ امیر تھے۔ بدر کا غزوہ مدینہ میں داخلہ کے ڈیڑھ سال کے بعد ہوا۔

اسلام کے دو علمی معجزے:

استاذ المکرّم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روز بخاری شریف کے درس میں امام شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کے حوالہ سے اسلام کے ان دو علمی معجزوں پر بڑی مدلل تقریر فرمائی اور یہ ثابت کیا کہ اسلام علم و عقل اور سائنس کے موجودہ دور میں ایک زندہ اور کامیاب مذہب کے طور پر اپنی افادیت کو دنیا کے انصاف پسند دانشوروں سے تسلیم کرا چکا ہے۔

مولانا مدنی علیہ الرحمۃ نے مختلف مغربی مفکرین اور ہندوستانی دانشوروں

کے حوالہ دیئے' اس ناچیز نے حضرت مدنی کے وہ افادات اپنے ادارہ (رحمت عالم) کی طرف سے ایک کتابچہ کی صورت میں شائع کئے ہیں۔

مغربی مفکرین میں امریکہ کے جدید مفکر مسٹر مائیکل ہارٹ کی مشہور کتاب دنیا کے سو بڑے (دی ہینڈرڈ) مولانا مدنی کے بعد منظر عام پر آئی' جس میں بڑے کھلے انداز میں مائیکل نے دنیا کے سو بڑے سماجی' سیاسی اور مذہبی رہنماؤں میں رسولِ پاک کو اوّلیت کا شرف تسلیم کیا۔

یہاں تک کہ اپنے رسول حضرت عیسٰی علیہ السلام کو بھی اس مقابلہ میں شامل کیا اور صاف صاف کہا کہ میری مسیحی قوم اس مقابلہ میں مجھ سے ضرور ناراض ہوگی' مگر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کو تسلیم کرنا ایک مؤرخ کا اخلاقی فرض ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنی تقریروں اور تحریروں میں مغربی دانشوروں کے بڑے حوالہ دیتے ہیں مگر وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ یہ دانشور حضور علیہ السلام کی عظمت و فضیلت کا تعلق آپ کے دینی' روحانی' معاشرتی اور سماجی انقلاب سے قائم کرتے ہیں ـــــ جو انقلاب آپ کی دعوتی و تبلیغی' تعلیمی اور روحانی (باطنی' قلبی) اصلاح کے ذریعہ برپا ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ نظریہ سے حضور علیہ السلام کی اس عظیم کامیابی کا غزوات اور تلوار سے تعلق قائم نظر آتا ہے۔

غزواتِ رسول کی عظمت اپنی جگہ ہے' اس سے انکار کون کرسکتا ہے؟ مگر ان کا تعلق دعوتِ حق سے قائم کرنا درست نہیں ہے۔''

☆ ☆ ☆

نوٹ: ماہنامہ ''دارالعلوم'' دیوبند میں شائع شدہ مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب کے مضمون میں درج قرآنی آیات کی کتابت میں جابجا لفظی غلطیاں موجود ہیں' بعض آیات کے حوالے بھی غلط ہیں۔ ہم نے یہ مضمون شائع کرتے ہوئے ان غلطیوں کی تصحیح کردی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے قرآنی آیات محض اپنے حافظے پر اعتماد کرتے ہوئے تحریر فرمائی ہیں' لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ ''دارالعلوم'' دیوبند نے بھی ان کی تصحیح ضروری نہیں سمجھی۔ (ادارۂ میثاق)

حقیقتِ دین

اسلام میں
خدمتِ خلق کا تصور

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

خدمتِ خلق کا عمومی تصور: دُنیوی فلاح و بہبود

جہاں تک خدمتِ خلق کے عمومی تصور کا تعلق ہے‘ یعنی نسلِ انسانی کے اُن افراد کی خدمت و امداد جو یتیمی یا بیوگی کی بنا پر یا کسی بیماری یا حادثے کے سبب سے یا کسی اور مجبوری و معذوری کے باعث معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں اور خود اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہو سکیں‘ تو اسلامی تعلیمات میں اس پر بھی زور و تاکید میں ہرگز کوئی کمی نہیں‘ بلکہ میری محدود معلومات کی حد تک اس کی جتنی تاکید اسلام میں ہے اتنی نہ کسی اور مذہب میں موجود ہے نہ کسی دوسرے نظامِ فکر میں —— تاہم اس میدان میں اسلام کی اصل (contribution) یہ ہے کہ اس نے خدمتِ خلق کے تصور کو دو ایسی نئی سمتیں (dimensions) عطا کی ہیں جو عام طور پر اِس میں شامل نہیں سمجھی جاتیں۔

اسلام میں انسانی ہمدردی کی تاکید

خدمتِ خلق کی تاکید اور اہمیت کے ضمن میں چند آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویہ کا حوالہ کافی ہوگا:

(۱) مذہب کے عام رسم پرستانہ تصور (Ritualistic Concept) کے

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq july05\ms10-06a.inp 8/22/2014 4:35 PM PAGE 1 (1,1)

مطابق اسلام کے بارے میں بھی عام تصور یہ قائم ہو گیا ہے کہ اس میں اصل اہمیت عبادات کی ہے۔ یہ غلط فہمی جب مزید پختہ ہوتی ہے تو عبادات کے بھی صرف ظاہری پہلو سے دلچسپی باقی رہ جاتی ہے اور اُن کی اصل روح کی جانب توجہ باقی نہیں رہتی۔ ان غلط تصورات کی نفی اور تردید کے ضمن میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ جسے آیۂ بِرّ کا نام دیا جاسکتا ہے‘ حد درجہ اہمیت کی حامل ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝﴾

’’نیکی صرف یہی نہیں ہے کہ تم اپنے رُخ مشرق و مغرب کی جانب کرلو‘ بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر‘ اور یومِ قیامت پر اور فرشتوں پر اور آسمانی کتابوں پر اور نبیوں پر‘ اور خرچ کیا اس نے مال اس کی محبت کے علی الرغم رشتہ داروں پر‘ اور یتیموں پر‘ اور محتاجوں پر‘ اور مسافروں پر‘ اور سائلوں پر اور لوگوں کی گردنوں کو غلامی یا قرض وغیرہ کے بندھنوں سے آزاد کرانے میں‘ اور قائم کی نماز اور ادا کی زکوٰۃ‘ اور پورا کرنے والے اپنے عہد کے جب باہم کوئی معاہدہ کرلیں‘ اور خصوصاً صبر کرنے والے فقر و فاقہ پر اور مصائب و تکالیف پر اور جنگ کے میدان میں۔ یہی لوگ ہیں حقیقت میں راست باز اور یہی ہیں فی الواقع متقی۔‘‘

اس آیۂ مبارکہ میں ایمان کے فوراً بعد‘ صلوٰۃ و زکوٰۃ سے بھی پہلے جو ارکانِ اسلام میں سے ہیں‘ ذکر کیا گیا ہے ابنائے نوع کی ہمدردی و مؤاساۃ کا اور ان کی تکالیف کے رفع کرنے یا ضروریات کے پورا کرنے میں اپنا مال صرف کرنے کا!

(۲) آیۂ بر میں جو بات نہایت تفصیل سے بیان ہوئی اسے حد درجہ اجمال کے

ساتھ بیان کر دیا گیا سورۂ آل عمران کی آیت ۹۲ میں‘ جس سے قرآن حکیم کا چوتھا پارہ شروع ہوتا ہے۔ یعنی:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾

’’تم نیکی کا رتبہ ہرگز حاصل نہیں کر سکتے جب تک (اللہ کی راہ میں) اپنی محبوب چیزیں نہ صرف کر سکو!‘‘

گویا انسانی ہمدردی کے وصف کے بغیر ایک انسان خواہ عالم بن جائے‘ خواہ عابد بن جائے‘ خواہ مفسر بن جائے‘ خواہ محدّث اور فقیہہ بن جائے اور خواہ مفتی‘ از روئے قرآن حکیم نیک ہرگز نہیں قرار پا سکتا۔

(۳) یہی حقیقت ہے جسے آنحضورﷺ نے حد درجہ فصاحت و بلاغت اور ایجاز و اعجاز کے ساتھ بیان فرمایا اِن الفاظ مبارکہ میں کہ:

((مَنْ یُحْرَمِ الرِّفْقَ یُحْرَمِ الْخَیْرَ))(۱)

’’جو شخص دل کی نرمی اور رقّتِ قلب سے محروم ہو گیا وہ (کُل کے کُل) خیر سے محروم ہو گیا!‘‘

(۴) اس مضمون کے اعتبار سے اس سے بھی زیادہ اہم اور واضح مقام قرآن حکیم کے آخری پارے میں سورۃ البلد میں ہے جہاں اوّلاً اللہ تعالیٰ نے انسان پر اپنے احسانات کا ذکر فرمایا ہے اور پھر شکوے کے انداز میں فرمایا ہے کہ: ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾﴾ ’’انسان گھاٹی کو عبور نہ کر سکا‘‘۔ پھر سوال کیا: ﴿وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾﴾ ’’تم جانتے ہو کہ وہ گھاٹی کون سی ہے؟‘‘ پھر جواباً ارشاد فرمایا: ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾﴾ ’’گردنوں کا بندھنوں سے چھڑا دینا‘ اور قحط کے ایّام میں کھانا کھلانا‘ کسی یتیم کو جو قرابت دار بھی ہے اور کسی محتاج کو جو مٹی میں رُل رہا ہے‘‘۔ اور اس کے بعد فرمایا: ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾﴾

---

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب البر والصلة والآداب‘ باب فضل الرفق۔ وسنن ابن ماجه‘ کتاب الادب‘ باب الرفق۔

''پھر شامل ہوا وہ اُن لوگوں میں جو ایمان لائے اور جنہوں نے باہم ایک دوسرے کو نصیحت کی صبر کی اور ایک دوسرے پر شفقت و رحمت کی!'' گویا یہاں انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کو مقدم کر دیا گیا خود ایمان پر جو دین کی اہم ترین اور بنیادی حقیقت ہے۔ اس سے اصلاً اشارہ کیا گیا ہے اِس حقیقت کی جانب کہ ایمان کا بیج صرف اُن لوگوں کی شخصیتوں میں پوری طرح بارآور ہوتا ہے جن میں انسانی ہمدردی کا یہ بنیادی وصف موجود ہو۔ اس کے برعکس بخیل اور کٹھور دل لوگوں کے دل کی زمین خود ایمان کے بیج کو بھی ضائع کر دیتی ہے۔

(۵) آنحضور ﷺ کی سیرتِ مبارکہ' جو دراصل قرآن ہی کی تفسیرِ کامل ہے' اسی حقیقت کی نمایاں ترین مثال ہے۔ آغازِ وحی سے قبل آنحضور ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں یہ تمام اوصاف بتمام و کمال و بدرجۂ اتم موجود تھے۔ چنانچہ جب پہلی وحی آئی اور آپؐ پر بنائے طبعِ بشری کسی قدر گھبراہٹ طاری ہوئی تو آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے انہی الفاظ میں آپؐ کو دلاسا دیا کہ:

> ''اللہ آپ کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا' آپ یتیموں اور بیواؤں کی سرپرستی فرماتے ہیں محتاجوں اور مسکینوں کی دستگیری فرماتے ہیں اور مسافروں اور بے آسرا لوگوں کی خدمت کرتے ہیں''۔

اور اسی کا کامل پرتو اور مکمل عکس ہے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی سیرت میں کہ جب آپ رضی اللہ عنہ ہجرتِ حبشہ کے ارادے سے مکّہ سے نکلے تو ابن الدّغنہ یہ کہہ کر باصرار انہیں واپس لے آیا کہ:

> ''ہم ہرگز آپ کو جانے نہیں دیں گے۔ آپ تو غریبوں اور مسکینوں کے غمگسار اور یتیموں اور بیواؤں کے سرپرست ہیں''۔

(۶) یہی سبب ہے کہ قرآن حکیم جملہ اخلاقِ حسنہ کی جڑ اور اساس ''جود و سخا'' کو قرار دیتا ہے اور تمام اوصافِ رذیلہ کی بنیاد بخل کو ٹھہراتا ہے' جیسے سورۃ اللیل میں فرمایا:

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۝ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی ۝
وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۝ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی ۝﴾

''پس جو جود وسخا اور تقویٰ سے متصف ہے اور ہر اچھی بات کی تصدیق کرتا ہے اسے تو ہم رفتہ رفتہ سب سے بڑی آسانی (یعنی جنت) تک پہنچا دیں گے۔ اور جو بخیل ہے اور بے پرواہی اختیار کرتا ہے اور اچھی بات کی تکذیب کرتا ہے تو اسے ہم رفتہ رفتہ سب سے بڑی مشکل (یعنی دوزخ) کا نوالہ بنا دیں گے۔''

(۷) قرآن حکیم کی اِن آیاتِ مبارکہ پر اگر اضافہ کر لیا جائے ان احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا کہ آپؐ نے فرمایا:

(i) ((اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ)) (۱)

''دین تو نام ہی خیر خواہی کا ہے''۔

(ii) ((خَیْرُ النَّاسِ اَنْفَعُھُمْ لِلنَّاسِ)) (۲)

''لوگوں میں سے بہترین شخص وہ ہے جو لوگوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچاتا ہے''۔

(iii) ((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ)) (۳)

''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے''۔

(iv) ((لَیْسَ الْمُؤْمِنُ بِالَّذِیْ یَشْبَعُ وَجَارُہٗ جَائِعٌ اِلٰی جَنْبِہٖ)) (۴)

''مؤمن کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ خود پیٹ بھر لے درآنحالیکہ اس کا پڑوسی بھوکا ہو''۔

تو بات بالکل کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اسلام انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق پر کس

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب الدین النصیحۃ للّٰہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین وعامتھم۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ان الدین النصیحۃ۔

(۲) صحیح الجامع الصغیر، ح ۳۲۸۹۔ **بحوالہ طبرانی و دارقطنی۔ امام البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔**

(۳) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من خصال الایمان ان یحب لاخیہ۔

(٤) رواہ البیہقی فی شعب الایمان (**بحوالہ** مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق)

قدر زور دیتا ہے! اس ضمن میں چوٹی کی حدیث وہ ہے جس کی رو سے کُل مخلوق کو خدا کا کنبہ قرار دیا گیا ہے:

((اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ، فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰہِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عِیَالِہٖ))(۱)

''تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، پس مخلوق میں اللہ کے نزدیک محبوب ترین وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ بھلائی کرے۔''

اور اسی کی شرح ہے جو بیان ہوئی ایک حدیثِ قدسی میں جس کی رو سے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ انسان سے شکوہ کرے گا کہ:

''(مفہوم حدیث) اے میرے بندے! میں بھوکا تھا، میں نے تجھ سے کھانا مانگا، لیکن تو نے مجھے کھانا نہ دیا۔ اے میرے بندے! میں ننگا تھا، میں نے تجھ سے کپڑے مانگے، لیکن تو نے مجھے کپڑے نہ پہنائے۔'' جس پر بندہ اظہارِ تعجب کرے گا کہ ''اے ربّ! تُو تو اِن تمام احتیاجات سے پاک ہے!'' تو اللہ فرمائے گا کہ ''میرے فلاں فلاں بندوں نے جب تیرے سامنے دستِ سوال دراز کیا تھا تو اُن کے پردے میں اصل سائل مَیں ہی تو تھا! اگر تو اُن بندوں کی ضروریات پوری کر دیتا تو آج اپنے ان اعمال کو میرے پاس موجود پاتا''۔(۲)

گویا قرآن وحدیث کی تعلیمات کی روشنی میں بالکل غلط نہیں کہا جس نے کہا کہ:۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

اور:۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بتسبیح و سجادہ و دلق نیست!

اور: ع

دل بدست آور کہ حج اکبر است

---

(۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان (**بحوالہ** مشکوٰۃ المصابیح)

(۲) دیکھئے: صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل عیادۃ المریض۔

خدمتِ خلق کے تصور کی تکمیل

لیکن جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں‘ اس میدان میں اسلام کی اصل contribution یہ ہے کہ اس نے خدمتِ خلق کے تصور کو دو نئے اعراض وابعاد یعنی dimensions عطا کیے —— جن میں سے ایک کا تعلق ہے اسلام کے اساسی نظریات ومعتقدات سے اور دوسرے کا تعلق ہے انسان کے نظامِ اجتماعی سے۔

اُخروی فوز وفلاح

چونکہ اسلام کے نزدیک انسان کی اصل زندگی دُنیوی زندگی نہیں بلکہ اُخروی زندگی ہے جو ابدی ولامتناہی ہے فحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى﴾ (الاعلیٰ) ’’آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی‘‘ —— اور: ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ (العنکبوت) ’’اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے‘ کاش کہ انہیں معلوم ہوتا‘‘ — اور بقول علامہ اقبال:۔

تو اسے پیمانۂ امروز وفردا سے نہ ناپ
جاوداں‘ پیہم دواں‘ ہردم جواں ہے زندگی!

لہٰذا اسلام کے نزدیک اصل فلاح و بہبود اور حقیقی کامیابی وکامرانی آخرت کی فلاح و بہبود اور آخرت کی کامیابی وکامرانی ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر اسلام میں انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کے تصور میں ایک بالکل نیا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ہے انسانوں کی اُخروی نجات اور اُخروی فوز وفلاح کی فکر اور اس کی سعی وجہد! اور ظاہر ہے کہ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اگر تو زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے‘ اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں تب تو اصل فلاح و بہبود یہیں کی فلاح و بہبود اور اصل عیش وآرام اسی دنیا کا عیش اور آرام ہے۔ بقول شاعر۔

’’بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست!‘‘

اور خدمتِ خلق کا تصور بھی اسی حد تک محدود رہے گا کہ بھوکوں کو کھانا کھلا دیا جائے‘

ننگوں کو کپڑے پہنا دیے جائیں' بیماروں کی دوادارو اور علاج معالجے کا بندوبست کر دیا جائے' محتاج گھر اور یتیم خانے کھول دیے جائیں' معذور لوگوں یعنی اندھوں' بہروں' لولوں' لنگڑوں اور نا قابل علاج امراض میں مبتلا لوگوں کے آرام و آسائش اور دل داری و دلجوئی کا اہتمام کیا جائے' لیکن اگر معاملہ دوسرا ہے اور اصل زندگی موت کی سرحد کے پار واقع ہوئی ہے اور وہ ''جاوداں'' بھی ہے اور ''پیہم دواں'' بھی تو اصل حقیقت وہ قرار پائے گی جو غزوۂ احزاب کے موقع پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مقدس زبانوں پر بایں الفاظ جاری ہوئی کہ ؎

اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃ

(اے اللہ! آخرت کے عیش کے سوا کوئی عیش نہیں!)

گویا اصل عیش ہے تو صرف آخرت کا اور اصل آرام و چین ہے تو صرف وہاں کا — اور اصل فوز و فلاح ہے تو اُخروی اور اصل کامیابی و کامرانی ہے تو آخرت کی۔ چنانچہ خلق کی اصل خدمت بھی یہ ہوگی کہ اس کی آخرت و عاقبت سنوارنے کی فکر کی جائے اور اسے ہمیشہ کے عذاب سے بچا کر دائمی امن و سکون اور آرام و اطمینان کی راہ پر ڈالا جائے۔ اور اصل خادمِ خلق وہ ہوگا جو خلق کی ہدایت کے لیے کوشاں ہو اور اس کی ابدی و سرمدی فوز و فلاح کے لیے اپنی جان' اپنا مال' اپنی قوتیں اور صلاحیتیں اور اپنا وقت صَرف کرے! چنانچہ یہی ہے خدمتِ خلق کا وہ تکمیلی مرحلہ جس میں صَرف ہوا آغازِ وحی کے بعد سے آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک لمحہ اور جس میں صَرف ہوئیں آپؐ کے جسم و جان کی جملہ قوتیں اور توانائیاں! اور اس میں اس درجہ انہماک تھا آپؐ کو کہ نہ صبح اس سے فارغ تھی نہ شام اور نہ دن اس سے خالی تھا نہ رات! چنانچہ دن کے اوقات میں اس کے لیے سرگرمی اور دوڑ دھوپ تھی دعوت و تبلیغ اور انذار و تبشیر کی صورت میں تو رات کی گھڑیوں میں اسی کے لیے مشغولیت تھی اللہ تعالیٰ سے خلق کی ہدایت کی دعا و استدعا کی شکل میں! فَصَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا. وَفَدَاہُ آبَاءُ نَا وَاُمَّھَاتُنَا!!

اسی کیفیت کو ایک تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے آنحضورﷺ نے کہ:

''میری اور تمہاری مثال ایسے ہے کہ آگ کا ایک بہت بڑا گڑھا ہے جس میں تم گر پڑنا چاہتے ہو اور میں تمہیں تمہارے کپڑے پکڑ پکڑ کر گھسیٹ رہا ہوں!''

اس کیفیت کا احساس کسی درجے میں ہم خود بھی کر سکتے ہیں کہ اگر سڑک پر کوئی اندھا جا رہا ہو اور ہم دیکھیں کہ آگے گڑھا ہے جو اِس غریب نابینا انسان کو نظر نہیں آ رہا تو کون خادمِ خلق ہوگا جو اسے چیخ کر خبردار کرنے اور اگر وہ بہرا بھی ہو تو دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر روکنے کی کوشش نہ کرے گا! بس اسی پر قیاس کر لیجیے کہ اگر کسی کی باطنی حِس بیدار ہو جائے اور وہ آگ کے اس عظیم گڑھے کا مشاہدہ اپنی باطنی بصیرت سے کر لے جسے جہنم کہتے ہیں اور جس کی جانب بے خبری و لاعلمی میں اس کے دوست' احباب' اعزّہ' اقربا' حتیٰ کہ تمام ابنائے نوع پورے جوش و خروش کے ساتھ بڑھے جا رہے ہوں تو کیا وہ دیوانہ وار اُن کو خبردار کرنے کی کوشش نہ کرے گا اور اپنی تمام توانائیاں اور قوتیں نوعِ انسانی کو اِس دردناک انجام سے بچانے میں نہ کھپا دے گا اور کیا اس کی اس وارفتگی میں بھوکوں کے پیٹ بھرنے اور ننگوں کے تن ڈھانپنے کی فکر بھی وقتی طور پر دب کر نہ رہ جائے گی؟ اس لیے کہ کسی کی پیٹ میں لگی ہوئی بھوک کی آگ بجھانے سے کیا حاصل اگر وہ کُل کا کُل آگ کا نوالہ بنا جا رہا ہو! اور کسی کی کسی وقتی اور فوری تکلیف اور عارضی احتیاج کو رفع کرنے کا کیا فائدہ جبکہ وہ دائمی اور مستقل عذاب کے راستے پر سرپٹ دوڑا جا رہا ہو۔ تاہم یہ بات میں نے صرف بغرضِ تفہیم عرض کی ہے' ورنہ منطقی طور پر درست ہونے کے باوجود یہ بات مطابقِ واقعہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلام میں جب دعوت و تبلیغ کا اصل محرک ہی خلقِ خدا کے ساتھ خلوص و اخلاص اور ان کی خیرخواہی و ہمدردی کا جذبہ ہے تو کیسے ممکن ہے کہ کوئی داعیٔ حق کسی کو تکلیف میں دیکھے اور تڑپ نہ اٹھے' اور اگر اُس کی تکلیف رفع کرنے پر کسی درجہ میں قادر ہو تو تن من دھن سے اس پر آمادہ نہ ہو جائے۔ بقول شاعر ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

یہ عرض کرنا غالباً تحصیلِ حاصل شمار ہوگا کہ آنحضورﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور کے بعد انسان دوستی' ابنائے نوع کی ہمدردی اور خدمتِ خلق کے اس ابتدائی اور عمومی اور اسلام کے نظامِ معتقدات کی رُو سے تکمیلی تصورات کی جامعیت کے نمونے نظر آتے ہیں صرف صوفیائے کرام کی شخصیتوں میں' جن کی دعوت وتبلیغ کا اصل محرک صرف خلق خدا کی خیر خواہی کا جذبہ تھا اور جن کی زندگیاں اس امر کا مُنہ بولتا ثبوت تھیں کہ وہ انسان دوست بھی ہیں اور خادمِ خلق بھی ـــــ مزید برآں یہ عرض کرنا بھی غیر ضروری ہی سا معلوم ہوتا ہے کہ خدمتِ خلق کے دونوں تصور کسی طرح بھی ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے' بلکہ ہر اعتبار سے ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور جس طرح خلق کی ہدایت اور اُس کی اُخروی فلاح کے لیے تبلیغ ودعوت صرف وہ درست ہے جس کی بنیاد میں خدمتِ خلق کا جذبہ کارفرما ہو اسی طرح خدمتِ خلق بھی صرف وہی حقیقی اور واقعی ہے جس کے ساتھ ابنائے نوع کی ہدایت ونصیحت اور اُن کی ابدی وسرمدی فوز وفلاح کا پہلو بھی موجود ہو ـــــ ورنہ صرف دُنیوی فلاح و بہبود کے کام بھی بسا اوقات صرف اپنی ذات کی projection اور اپنی اَنا کی تسکین ـــــ اور حصولِ شہرت بلکہ جاہ پسندی اور اقتدار طلبی کے ذرائع بن کر رہ جاتے ہیں۔

قیامِ نظامِ عدلِ اجتماعی

فکرِ اسلامی نے خدمتِ خلق کے تصور کو ایک مزید سمت (dimension) قیامِ نظامِ عدلِ اجتماعی کی سعی و جہد کی صورت میں عطا کی ہے' یعنی ایک ایسا عادلانہ و منصفانہ معاشرہ برپا کیا جائے اور ایک ایسا مبنی بر قسط و عدل نظامِ اجتماعی قائم کیا جائے جس میں کوئی کسی کی حق تلفی نہ کرے' چنانچہ نہ سیاسی جبر اور حاکمانہ استبداد (Political Repression) باقی رہے نہ مالی و معاشی استحصال (Economic Exploitation)۔ اس لیے کہ جتنی سفیہانہ و احمقانہ بات یہ

ہے کہ گندگی کے ڈھیروں اور بیماری کے منبعوں اور سرچشموں سے تو کوئی تعرض نہ کیا جائے اور سارا زور دوادارو اور علاج معالجے ہی پر صَرف کر دیا جائے' اتنی ہی نادانی اور سادہ لوحی پر مبنی ہے یہ بات بھی کہ ایک ظالمانہ نظام کو تو قائم رکھا جائے' البتہ اس ظلم کی چکی میں پس کر معذور و بے بس ہو جانے والے لوگوں کے لیے محتاج گھر کھول کر اپنی جھوٹی نیکی اور کھوٹی رحم دلی کے جذبہ کی تسکین کا اہتمام کیا جائے ـــــ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں کارِ نبوت اور فریضۂ رسالت کے ہدف و مقصود کی تعبیر کی گئی ان الفاظ سے کہ:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (الحدید: ۲۵)

''اور ہم نے بھیجے اپنے رسول واضح تعلیمات اور بیّن نشانیوں کے ساتھ اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب و شریعت بھی اور اتارا ایک متوازن نظامِ اجتماعی بھی' تاکہ لوگ قائم ہوں عدل و قسط پر۔''

اور اُس نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام و نفاذ کے لیے ضرورت پڑنے پر لوہے کی قوتِ حرب و ضرب کے استعمال کو تعبیر کیا گیا اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد و نصرت ایسے اعلیٰ و ارفع مقام اور مرتبے سے' از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ﴾

''اور ہم نے اتارا لوہا جس میں حرب و ضرب کی شدید صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے بعض دوسرے فوائد بھی' تاکہ اللہ دیکھے کہ کون ہیں وہ لوگ جو مدد کرتے ہیں اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب میں ہونے کے باوجود''۔

اور یہی سبب ہے اس کا کہ سورۃ البقرۃ کی جس آیۂ برّ کا حوالہ میں نے بالکل آغاز میں دیا تھا اور جو قرآن حکیم میں نیکی اور تقویٰ کی حقیقت کے موضوع پر جامع ترین آیت ہے اُس میں ایمان کے بعد نیکی کے مظاہر عملی میں ابتدا میں ذکر ہوا انسانی ہمدردی اور خیرات و صدقات میں اپنا محبوب مال صرف کرنے کا اور اُس کا اختتام

ہوا میدانِ جنگ میں صبر و مصابرت کے ذکر پر۔ گویا از روئے قرآن حکیم نیکی کی چوٹی یا ''ذروۃ السنام'' یہ ہے کہ دین حق یا نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام و نفاذ کے لیے انسان نقد جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں حاضر ہو جائے اور پھر کسی صورت میں قدم پیچھے نہ ہٹائے!—— چنانچہ یہی ہے وہ بات جو فرمائی تھی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فاتحِ ایران نے سپہ سالارِ افواجِ ایران کے اس سوال کے جواب میں کہ جب فی الوقت ہمارے اور تمہارے مابین کوئی نزاع موجود نہیں ہے تو تم لوگ کیوں ہم پر چڑھ آئے ہو؟ حضرت سعدؓ نے جواب دیا:

''اِنَّا قَدْ اُرْسِلْنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمٰتِ الْکُفْرِ وَالْجَھَالَۃِ اِلٰی نُوْرِ الْاِیْمَانِ وَمِنْ جَوْرِ الْمُلُوْکِ اِلٰی عَدْلِ الْاِسْلَامِ''

یعنی ''ہم اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ لوگوں کو کفر و جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لائیں اور بادشاہوں کے ظلم و ستم کے پنجے سے نجات دلا کر اسلام کے عدل سے روشناس کریں!''

حضرت سعدؓ کے اس جملے میں ایک جانب تو اشارہ ہو گیا اس حقیقت کی طرف کہ ع ''میں آیا نہیں لایا گیا ہوں!'' کے مصداق اسلام کے صدرِ اوّل میں مسلمان خود کسی ''مالِ غنیمت یا کشور کشائی'' کے شوق میں نہیں نکلے تھے بلکہ ان کا نکلنا خالصتاً خدائی حکم کے تحت گویا ''مامور من اللہ'' ہونے کی حیثیت سے تھا اور دوسری جانب اس ایک جملے میں بیک وقت جمع ہو گئے فکرِ اسلامی اور تعلیم قرآنی کے وہ دونوں پہلو جنہیں میں نے خدمتِ خلق کے تصور کے ضمن میں اسلام کی عطا کردہ دو نئی سمتوں 〈dimensions〉 سے تعبیر کیا ہے!

یہاں یہ مغالطہ نہ ہو کہ اسلام نے شاید صرف سیاسی حقوق ہی پر زور دیا ہے۔ واقعہ اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ اسلام نے اصل زور معاشی عدل و انصاف اور سرمایہ و دولت کی منصفانہ تقسیم اور ذرائع پیداوار پر تصرّف کے عادلانہ نظام پر دیا ہے اور اس ضمن میں اپنے ہدف مطلوب اور صحیح مقصود کو تعبیر فرمایا ہے ان مبارک اور جامع الفاظ سے کہ:

﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ﴾ (الحشر:۷)

''ایسا نہ ہو کہ سرمایہ تمہارے دولت مندوں ہی کے مابین گردش میں رہے''۔

یعنی یہ نہ ہو کہ ملک کی کُل دولت سمٹ کر چند خاندانوں یا ایک مخصوص طبقے کے قبضہ و تسلط میں چلی جائے جن کا باہمی لین دین لاکھوں اور کروڑوں کے حساب سے ہو' چنانچہ ایک ایک دعوت اور ایک ایک تقریب پر لاکھوں صرف ہو جائیں اور دوسری طرف ایک طبقہ ایسا وجود میں آ جائے جسے نانِ جویں کے بھی لالے پڑے ہوں اور پھر وہ حرام اور سراسر ظلم وناانصافی سے کمائی ہوئی دولت کی بنا پر وجود میں آئے ہوئے لکھ پتی اور کروڑ پتی لوگ اپنی دیگوں کی کھرچن اُن بھوکوں کے سامنے ڈال کر حاتم طائی کی قبر پر لات ماریں اور اپنے جود وسخا کے دل خوش کن تصور سے شادکام ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضورﷺ نے صاف واضح فرما دیا کہ حرام کی کمائی سے صدقہ وخیرات خدا کے یہاں بالکل مقبول نہیں ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ وَلَا يَقْبَلُ اِلَّا طَيِّبًا)) (۱)

''اللہ خود پاک ہے اور صرف پاک چیز ہی قبول کرتا ہے۔''

حتیٰ کہ حرام خور کی دعا بھی اللہ کے یہاں مقبول نہیں:

((.....وَمَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهٗ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهٗ حَرَامٌ وَغُذِّيَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ)) (۲)

''.....جبکہ اس کا کھایا ہوا بھی حرام کا ہے' پیا ہوا بھی حرام کا ہے' پہنا ہوا بھی حرام کا ہے' اور اس کا سارا تن وتوش حرام کی غذا سے تیار ہوا ہے' تو اس کی دعا قبول ہو تو کیسے؟''

جبکہ دوسری طرف تصور دیا گیا کہ حلال کی کمائی سے انسان اگر اپنی بیوی کے مُنہ میں بھی لقمہ ڈالتا ہے تو اللہ کے یہاں اسے بھی صدقہ قرار دیا جاتا ہے!——اور یہی سبب ہے

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب قبول الصدقة من الکسب الطیب وتربیتها۔

(۲) سنن الترمذی' کتاب تفسیر القرآن عن رسول الله' باب ومن سورة البقرة۔ومسند احمد' کتاب باقی مسند المکثرین' باب باقی المسند السابق۔

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq july05\ms10-06a.inp 8/22/2014 4:35 PM PAGE 7 (1,1)

کہ اسلام کے نظامِ خلافت کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے وہ بات جسے خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا بیعت خلافت کے بعد اپنے پہلے خطبے میں بایں الفاظ کہ: ’’تم میں سے ہر کمزور میرے نزدیک قوی ہوگا جب تک اُسے اس کا حق دلوانہ دوں اور ہر قوی میرے نزدیک ضعیف ہوگا جب تک اُس سے حق وصول نہ کرلوں!‘‘ اور بالکل صحیح کہا ہے علامہ اقبال مرحوم نے ’’نکتۂ شرعِ مبیں‘‘ کی اس وضاحت میں کہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس!

الغرض جس طرح ’’prevention is better than cure‘‘ کے مسلّمہ اصول کے مطابق حفظانِ صحت کی جملہ تدابیر اختیار کر کے بیماری کا انسداد و سدّ باب کرنا اہم تر اور مقدم تر ہے' البتہ اس کے باوجود جو بیماریاں پیدا ہو ہی جائیں ان کے ضمن میں علاج معالجے کا اہتمام بھی ضروری ہے' اسی طرح نظامِ اجتماعی کو اِن تمام ناہمواریوں سے پاک کر کے ہر جہت سے عدل وقسط پر استوار کرنا ہر طرح اہم تر اور مقدم تر ہے' تاکہ وہ محرومیاں اور ناداریاں وجود ہی میں نہ آئیں اور غربت وافلاس پیدا ہی نہ ہو جس کے لیے صدقہ وخیرات کی حاجت ہو' البتہ اس کے باوصف اگر کوئی کسی سبب سے معذور ولاچار ہو ہی جائے تو ضرورت ہے کہ ابنائے نوع کے قلوب ہمدردی اور انسان دوستی کے جذبہ سے اس درجہ سرشار ہوں کہ وہ اپنی محبوب ترین متاع کو اُن کے ازالے کے لیے صَرف کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کریں! چنانچہ یہی ہے اسلام کا جامع ترین تصورِ خدمتِ خلق جس میں وہ عام تصورِ خدمتِ خلق بھی شامل ہے جو سب کو معلوم ہے اور مزید برآں وہ مزید دو سمتیں بھی شامل ہیں جن میں سے ایک کا تعلق اسلام کے مخصوص نظامِ عقائد وایمانیات سے ہے —— اور دوسری کا انسان کے نظامِ اجتماعی سے! —— اور ان تینوں کا کامل ظہور ہوا تاریخ انسانی کے اُس دَور میں جس کی یاد نوعِ انسانی کی اجتماعی یادداشت (Collective Memory) میں بالکل اسی طرح محفوظ ہے جس طرح کسی فرد کے دل ودماغ میں کسی حسین خواب کی یاد باقی رہ جاتی ہے

اور جسے دنیا ''خلافتِ راشدہ'' کے نام سے جانتی ہے' جس میں ایک جانب انسانی اخوت اوراس سے پیدا شدہ باہمی ہمدردی ومؤاساۃ انتہائی بلندیوں پر تھیں تو دوسری جانب حریت آخری ممکنہ حد کو پہنچی ہوئی تھی' اور تیسری جانب مساوات کامل ترین صورت میں جلوہ گر تھی۔ بقول علامہ اقبال مرحوم:۔

کُلُّ مُؤْمِن اِخْوَۃٌ اندر دلش
حریت سرمایۂ آب و گلش
ناشکیبِ امتیازات آمدہ!
در نہادِ او مساوات آمدہ!

جس کی برکات کا ادنیٰ مظہر یہ ہے کہ لوگ خیرات وصدقات کا مال لیے پھرتے تھے اورانہیں قبول کرنے والا دستیاب نہ ہوتا تھا! فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ وَاَحْ الْحَاکِمِیْنَ!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(یہ مقالہ محترم ڈاکٹر صاحب حفظہ اللہ نے لائنز کلب گلبرگ لاہور کے اجلاس منعقدہ ۲۳؍جنوری ۱۹۷۸ء میں پیش کیا۔)

اسلامی نظامِ عبادات میں
اعتدال کی حکمتیں

مرتب: حافظ محبوب احمد خان

تاریخ مذاہب پر نظر رکھنے والوں کے لئے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ نیکی کا جذبہ انسان میں ودیعت کیا گیا ہے۔ ہر مذہب اور ہر معاشرے میں نیکی کے مختلف تصورات ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ آسمانی مذاہب ہوں یا غیر آسمانی مذاہب' نیکی کے جذبے کے مختلف اظہار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اسلام چونکہ ایک دین فطرت ہے لہٰذا اس نے اپنے نظامِ عبادات میں اہداف و مقاصد کو پیش نظر رکھا ہے۔ عبادات میں انسان اگر ان اہداف و مقاصد کو پیش نظر نہ رکھے تو غالب امکان ہے کہ اس کی عبادات کا رخ رُہبانیت کی جانب چلا جائے گا' جیسا کہ عیسائیت کی مذہبی تاریخ گواہ ہے۔ اور اگر عبادات کی روح انسان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے تو پھر معاملہ یہودیت سے جا ملے گا جہاں ظاہر پرستی نے اس قدر غلبہ پا لیا تھا کہ عبادات کی روح غائب ہو گئی تھی۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں معاشرے اور افراد کی تباہی کی شکل میں سامنے آئے گا۔

اب اگر ہم یہ جائزہ لیں کہ اسلام کے نظامِ عبادات کا مقصود و ہدف کیا ہے تو نظر آتا ہے کہ اسلام اپنے پیروکاروں کے لئے ایسا نظامِ عبادات تشکیل دیتا ہے کہ نہ صرف فرد کی انفرادی سیرت و کردار کی تشکیل و تعمیر کا کام کرے بلکہ معاشرے کے لئے بھی اس کی شخصیت فائدہ مند ثابت ہو۔ تاریخ سے استشہاد قرآن کریم کا تیسرا بڑا موضوع ہے۔ انبیاء کی دعوت کے مدارج کا اگر جائزہ لیا جائے تو انسانی کردار کی تشکیل میں ایک بڑی پیاری ترتیب نظر آتی ہے۔ حضرت نوح' حضرت صالح اور حضرت ہود علیہم السلام نے عقائد کے ضمن میں انسانی افکار کی تطہیر کی' جبکہ حضرت لوط علیہ السلام نے انسانی زندگی کے معاشرتی پہلو میں توازن و اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے انسانی زندگی کے معاشی پہلو کے حوالے سے اصلاح کی کوشش کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جدوجہد ایک پاکیزہ نظامِ

ehboob

سیاست (غیر اللہ کی حاکمیت کا انکار اور اللہ کی حاکمیت کا اثبات) کے لیے تھی‘ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انسانی زندگی کو اخلاقی تعلیمات سے آراستہ کر کے انسانی شخصیت کی تکمیل کی۔

نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات ہر اعتبار سے جامع ہیں۔گویا عقائد‘ معاشرت‘ معیشت‘ سیاست اور اخلاقیات کی تعلیم سے آراستہ ہو کر ایک مکمل انسانی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔قرآن کریم نے کئی مقامات پر بندۂ مؤمن کی تصویر پیش کی ہے‘ جن میں اہم ترین مقام سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ ہے جسے آیت البرّ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

﴿لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰـکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِکَةِ وَالۡکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنَ وَابۡنَ السَّبِیۡلِ ۙ وَالسَّآئِلِیۡنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّکٰوةَ ۚ وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا ۚ وَالصّٰبِرِیۡنَ فِی الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیۡنَ الۡبَاۡسِ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا ؕ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ﴿۱۷۷﴾ (البقرۃ)

’’نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو‘ بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر‘ اور یومِ آخر پر‘ اور فرشتوں پر‘ اور کتابوں پر‘ اور انبیاء پر اور دیا اس نے مال اس کی محبت کے علی الرغم رشتے داروں کو‘ اور یتیموں کو‘ اور محتاجوں کو‘ اور مسافروں کو‘ اور سائلوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں۔اور قائم کی اس نے نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔اور پورا کرنے والے اپنے عہد کے جبکہ کوئی باہم معاہدہ کر لیں۔اور بالخصوص صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں‘ تکالیف و مصائب پر اور جنگ کے وقت۔یہی ہیں وہ لوگ کہ جو واقعتاً راست باز ہیں‘ اور یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقتاً متقی ہیں۔‘‘

نیکی کے جذبہ کے ضمن میں بھی اس بات کا خطرہ موجود ہے کہ کسی وقت یہ ضرورت سے زیادہ مشتعل ہو کر حدِّ اعتدال سے تجاوز کر جائے اور نتیجتاً نیکی سے بدی ظہور میں آجائے۔مثلاً ایک شخص پر نیکی کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ وہ دنیا کو چھوڑ دے اور پہاڑوں کی کھوؤں اور غاروں میں جا کر دھونی رما لے کہ بس ربّ سے لو لگانی ہے۔رہبانیت کا نظام اسی نیکی کے جذبہ کے حدِّ اعتدال سے تجاوز کی وجہ سے وجود میں آیا۔لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ

رویّہ فطرت کے خلاف بغاوت ہے۔ فطرتِ انسانی میں جو داعیات ہیں یہ اُن سے دھینگا مشتی ہے۔ چنانچہ طبعِ بشری اور فطرتِ انسانی بسا اوقات انسان کو پچھاڑ دیتی ہے اور نتیجتاً اس کا ایک ردِّعمل ظاہر ہوتا ہے۔ عیسائی راہب خانوں میں اس ردِّعمل کے نتیجے میں جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

رہبانیت کی نفی ایک حدیث نبویؐ میں بڑی وضاحت سے وارد ہوئی ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی کے دوران صحابہ کرام ؓ میں سے تین اشخاص ازواجِ مطہرات ؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے حضور ﷺ کی نفلی عبادات کے بارے میں دریافت کیا کہ رات کو آپؐ کتنی نفلی نماز پڑھتے ہیں؟ مہینہ میں کتنے نفلی روزے رکھتے ہیں؟ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ ایک کھلی کتاب کی مانند تھی' اس میں تصنّع کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ ازواجِ مطہراتؓ نے کسی بات میں مبالغہ نہیں کیا' جو صحیح صحیح بات تھی وہ بتا دی۔ ان صحابہؓ نے آپؐ کے اس معمول کو کم جانا' لیکن انہوں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ حضور ﷺ تو معصوم ہیں' آپؐ سے تو کسی خطا کا صدور ممکن ہی نہیں' آپؐ کو تو اتنی نفلی عبادات کی بھی ضرورت نہیں جتنی آپؐ کر رہے ہیں' یہ بھی آپؐ کے لیے بہت ہے' لیکن ہمارے لیے یہ کافی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک نے کہا کہ میں تو پوری رات (نفلی) نمازوں میں گزاروں گا' کبھی نہیں سوؤں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا' کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں شادی اور گھر گرہستی کا لکھیڑ مول نہیں لوں گا' اس سے تو اللہ سے لو لگانے اور تعلق استوار کرنے میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں' میں تو ساری عمر تجرد کی زندگی بسر کروں گا۔ حضور ﷺ کو اس کی خبر پہنچی تو آپؐ اپنی عادتِ شریفہ اور خُلق کریم کے برعکس ناراض ہوئے۔ آپ ﷺ نے ان تینوں کو بلا بھیجا اور فرمایا کہ ''میں تم میں سے ہر ایک سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں' لیکن میں رات کو سوتا بھی ہوں اور (نفلی) نماز بھی ادا کرتا ہوں' میں (نفلی) روزے رکھتا بھی ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں' میں نے شادیاں بھی کی ہیں اور میرے حبالۂ عقد میں متعدد ازواج ہیں''۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) ''(کان کھول کر سن لو! نیکی چاہے کتنے ہی خلوص کے تحت ہو' لیکن) جس کسی نے میری سنت اور میرے طریقے کو چھوڑ دیا (اور اس کے برعکس روش اختیار کی) تو اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔ پس اس طرح ہمارے لیے نیکی کے معیارِ کامل ہیں جناب محمد رسول اللہ ﷺ۔

ہمارے لیے ضروری ہے کہ ایک اسوۂ حسنہ‘ایک کامل نمونہ‘ایک آئیڈیل ہمارے سامنے رہے جس میں نیکی کے تمام اعمال ایک توازن اور اعتدال میں سموئے ہوئے مل جائیں۔اسی کو ہم کسوٹی سمجھیں‘ ہر عمل کے بارے میں اس کی طرف رجوع کریں کہ یہ عمل اس معیارِ کامل میں کتنا ہے اور دوسرے اعمال کے ساتھ اس کا تناسب کیا ہے.....! یہ اسوۂ حسنہ و کاملہ وہ ہے جو ہمیں انبیاء و رُسل کی زندگیوں میں ملتا ہے اور اس مقدس جماعت میں کامل ترین اور افضل ترین ہیں جناب محمد رسول اللہ ﷺ۔ یعنی تمام نیکیاں‘ تمام بھلائیاں‘ تمام خیرات وحسنات اگر ایک شخصِ واحد میں معتدل‘ متوازن اور جامعیت کے ساتھ دیکھنی ہوں تو اس کا نمونہ اور کسوٹی ہیں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ۔

اسلامی نظام عبادات میں اعتدال کی پہلی حکمت کے طور پر یہ جاننا چاہیے کہ اسلام میں عبادت کا مقصد نفس کشی نہیں‘ بلکہ ضبطِ نفس ہے۔اگر نفس کو مجبور کر کے عبادت کا معاملہ کیا جائے گا تو خشوع وخضوع والی کیفیت ختم ہو جائے گی اور یہ عبادت محض ایک مشقت بن کر رہ جائے گی۔ ہر چیز کی ایک حرص ہوتی ہے اور ایک حد کے بعد اُس حرص میں کمی آنا شروع ہو جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ جن پر بیٹھے بٹھائے ایک دم تقویٰ کا ہیضہ ہو جاتا ہے وہ عمل صالح میں اِس قدر شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ عبادات کا مقصد کھو بیٹھتے ہیں‘ وہ پھر رفتہ رفتہ اس عمل میں سستی اختیار کرنے لگ جاتے ہیں۔

عبادات میں حدّ و مقدار کی دوسری حکمت کو یوں سمجھئے کہ جیسے ایک مریض کے مرض کے ازالے کے لیے دوا کی صرف ایک مقدار مقرر کی جاتی‘ جو اس کے مرض کا ازالہ کر دے اور اس میں کمی بیشی نہیں کی جاتی۔اور یہ معاملہ مریض کی مرضی پر ہرگز نہیں چھوڑا جاتا‘ کیونکہ اگر یہ معاملہ اس کی مرضی وخوشی پر چھوڑ دیا جائے تو مریض اپنی طبیعت کے مطابق اس دوا میں کمی بیشی کر جائے گا‘ یعنی اگر دوا کڑوی ہوئی تو مریض اس میں لازماً کمی کر جائے گا‘ کیونکہ دوا کی کڑواہٹ کو انسانی طبیعت آسانی سے قبول نہیں کرتی‘ جبکہ اگر دوا میٹھی ہو تو انسانی طبیعت اس میں رغبت رکھتی ہے‘ تو ایسی صورت میں بھی مریض سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس مقدار اور حد کو قائم رکھ سکے گا۔

عبادات میں حدّ و مقدار مقرر کرنے کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان ایک معاشرے کا حصہ ہے۔جس طرح اس پر عبادات کی ذمہ داری ہے اسی طرح اس پر معاشی‘ معاشرتی‘ سیاسی اور اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ بلکہ ایک جامع اصطلاح کے طور پر ’’حقوق العباد‘‘ کو

پورا کرنا بھی اس پر لازم ہے۔ اسی طرح ایک صالح معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔ لہٰذا تیسری حکمت یہ ہے کہ انسان اپنی ان تمام ذمہ داریوں کو بھی عبادات کے ساتھ ساتھ ادا کر سکے۔ ان ذمہ داریوں کی تفصیل ایک حدیث مبارکہ میں ہے' جسے امام ترمذی نے کتاب الزہد میں اس طرح بیان کیا ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے حضرت سلمان اور حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہما کے مابین مواخات قائم کی۔ حضرت سلمانؓ حضرت ابودرداءؓ سے ملنے گئے تو انہوں نے (ان کی بیوی) اُمّ درداء کو پریشان دیکھا تو اُن سے ان کی پریشانی کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے کہا: ''تمہارے بھائی ابودرداء کو دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں (متاع دنیا کی کوئی ضرورت نہیں)۔ پھر جب حضرت ابودرداءؓ آئے تو حضرت سلمانؓ نے ان کو کھانا پیش کیا' مگر انہوں نے کہا آپ کھائیے' میں روزے سے ہوں۔ حضرت سلمانؓ نے کہا میں بھی نہیں کھاؤں گا جب تک آپ نہ کھائیں' تو حضرت ابودرداءؓ نے کھانا کھا لیا۔ جب رات ہوئی تو حضرت ابودرداءؓ قیام کرنے چلے گئے (نوافل پڑھنے لگے)۔ حضرت سلمانؓ نے ان سے کہا سو جائیے' تو وہ سو گئے۔ پھر حضرت ابودرداءؓ اٹھنے لگے تو سلمانؓ نے ان سے کہا سو جائیے تو وہ سو گئے۔ پس جب صبح کا وقت ہوا تو سلمانؓ نے ان سے کہا اب اٹھ جائیے۔ پس وہ دونوں اٹھے اور نماز ادا کی۔ حضرت سلمانؓ نے حضرت ابودرداءؓ سے فرمایا: ''یقیناً تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے' تمہارے ربّ کا بھی تم پر حق ہے' تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے اور یقیناً تمہارے گھر والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ پس ہر حقدار کو اس کا حق ادا کیجئے''۔ پھر وہ دونوں حضور ﷺ کے پاس آئے اور یہ سارا ماجرا ذکر فرمایا تو حضور ﷺ نے حضرت ابودرداءؓ سے فرمایا: ''سلمان (رضی اللہ عنہ) نے سچ کہا۔''

چوتھی حکمت عبادات میں اعتدال کی یہ ہے کہ انسانی نفس کو راہ راست پر رکھا جائے اور اس کی کجی کو دور کیا جائے۔ انسان سے یہ مطلوب نہیں ہے کہ وہ ہر قسم کی عبادات کو سرانجام دے۔ چونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے اس لیے اس سے اس قسم کا مطالبہ دشوار بات معلوم ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک' جسے امام نسائی نے کتاب القبلۃ میں اس طرح بیان کیا:

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کی ایک چٹائی تھی' حضور ﷺ دن کے اوقات میں اسے پھیلا دیتے اور رات کے اوقات میں اس کو حجرہ بنا دیتے اور اس میں نماز ادا فرماتے۔ پس لوگوں نے سمجھا (کہ شاید آپؐ ساری رات قیام فرماتے

ہیں) تو انہوں نے بھی آپؐ کے ساتھ نماز ادا کی' جبکہ آپؐ اور ان لوگوں کے درمیان چٹائی تھی۔ پس آپؐ نے فرمایا: ''اتنا ہی عمل کرو جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تکلیف میں مبتلا نہیں کرتا جب تک کہ تم خود کو تکلیف میں نہ ڈالو۔ یقیناً اللہ کو سب سے زیادہ وہ عمل پسند ہے جس میں ہمیشگی ہو' چاہے وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو''۔ پس آپؐ نے وہ جائے نماز چھوڑی' آپؐ دوبارہ اس پر نہیں آئے یہاں تک کہ اللہ عزوجل نے آپؐ کو اٹھالیا۔ اور آپؐ کی عادت مبارکہ تھی کہ جو نیکی کا عمل بھی کرتے اس پر ثابت قدم رہتے۔''

انسانی وجود دو چیزوں سے مرکب ہے: روح اور مادی جسم۔ عبادات کا ایک مقصد یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کو کمزور کر دیا جائے اور روحانی تقاضوں کو بلند کر دیا جائے۔ اور جب انسان نیکی پر خوشی محسوس کرے اور گناہوں پر رنجیدہ ہو جائے تو سمجھ لے کہ یہ مقصد حاصل ہو گیا ہے۔ اور اگر وہ عبادات میں کثرت کرے گا تو نفس اس کا عادی ہو جائے گا اور اس عبادت کے ثمرات اس کو حاصل نہیں ہو سکیں گے۔

پانچویں حکمت یہ ہے کہ انسان کی عبادات محض اس کے اپنے لیے نہیں ہیں بلکہ یہ آنے والی نسلوں کی تربیت کا سامان بھی ہے۔ اگر وہ عبادات میں تعمق اختیار کرلے گا تو اس کے بعد جو لوگ اس سے سیکھنے والے یا اس کے پیروکار ہوں گے ان کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ شاید یہ عبادات عین تقاضائے اسلام ہیں اور ہم پر فرض ہیں۔ اور نسلوں کے تواتر سے یہ اعمال لوگوں کے لیے فرض کا درجہ اختیار کر جائیں گے اور نتیجہ یہ کہ جن اعمال کی فرضیت میں احتمال تھا اب ان کی فرضیت پر لوگوں کو اطمینان ہو جائے گا اور اس سے دین میں تحریف لازم آئے گی۔

اس ضمن میں ایک حدیث مبارکہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ آپ زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں' اپنے سے نیچے والوں پر نگران ہیں۔ آپ کا ہر عمل ان کے لیے ایک نمونہ بنتا ہے۔ اور انسان کے لیے لازم ہے کہ انسانوں کے لیے ایسا نمونہ بنے جو ان کے لیے آسانی پیدا کرے نہ کہ ان کے لیے مزید مسائل کا پیش خیمہ بن جائے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللّٰہ عنہما عَنِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّہٗ قَالَ: ((اَلاَ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ ' فَالْاَمِیْرُ الَّذِیْ عَلَی النَّاسِ رَاعٍ وَھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ ' وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰی اَھْلِ بَیْتِہٖ وَھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْھُمْ'

وَالْمَرْاَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ بَعْلِهَا وَوَلَدِهٖ وَهِيَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ، وَالْعَبْدُ رَاعٍ عَلٰى مَالِ سَيِّدِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُ ، اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ)) (صحيح مسلم، كتاب الامارة)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور اُس سے اُس کے ماتحتوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔ پس حاکم اپنے ماتحتوں کا ذمہ دار ہے اور اُس سے اُن کے متعلق پوچھا جائے گا، اور مَرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے اور اُس سے اُن کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی، اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی ذمہ دار ہے اور اُس سے اُن کے متعلق باز پُرس کی جائے گی اور غلام اپنے آقا کے مال کا ذمہ دار ہے اور اُس سے اُس کے متعلق پوچھا جائے گا۔ خبردار رہیے! تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اُس کی ذمہ داری کے متعلق سوال کیا جائے گا''۔

قرآن کریم میں عدم توازن اور عدم اعتدال کی مثال متبعین عیسٰی علیہ السلام سے دی گئی ہے:

﴿ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾ (الحديد)

''پھر ہم نے ان کے پیچھے انہی کی راہ پر اور رسول بھیجے اور ان کے پیچھے عیسٰی ابن مریم کو مبعوث کیا اور انہیں انجیل عطا فرمائی، اور ہم نے رکھ دی ان لوگوں کے دلوں میں جو عیسٰی کے تابع فرمان تھے، شفقت اور رحمت۔ اور رہبانیت کو انہوں نے خود ایجاد کیا تھا، ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا، البتہ انہوں نے رضائے الٰہی کے حصول کے لیے اسے اختیار کیا تھا، پھر اسے وہ نباہ نہ سکے جیسے کہ اس کے نباہنے کا حق تھا۔ پس ہم نے عطا فرمایا جو ان میں سے ایمان لے آئے تھے، ان (کے حسن عمل اور حسن نیت) کا اجر اور ان میں سے اکثر فاسق (و فاجر) تھے۔''

متبعین مسیح علیہ الصلاۃ والسلام میں اگر رَہبانیت کا نظام آیا تو جہاں اس میں شیطان کے اغوا و اِضلال کا معاملہ ہوا کہ اس نے انہیں جہاد و قتال، انقلاب اور اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد سے ہٹا کر اُن کی صلاحیتوں کو اُس رخ پر موڑ دیا وہاں اس کے لیے کچھ

اسباب بھی موجود تھے۔ لیکن حضورﷺ کی اُمت میں اگر یہ معاملہ آیا ہے تو اس کی نسبت سینکڑوں درجے زیادہ قابل مذمت ہے' اس لیے کہ ان اسباب میں سے کوئی سبب یہاں موجود نہیں۔ حضورﷺ کی حیاتِ طیبہ اور آپؐ کا اُسوہ نہایت جامع اور نہایت متوازن ہے اور اس میں دین و دنیا کا مکمل اور خوبصورت امتزاج ہے۔ یہاں تک کہ تعدّدِ ازدواج اس ضمن میں سیرت کی سب سے نمایاں بات ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ کڑوی گولی عیسائیوں کے حلق سے قطعاً نہیں اترتی' اس لیے کہ ان کا آئیڈیل حضرات مسیح اور یحییٰ علیہما السلام ہیں اور انہوں نے ایک ایک شادی بھی نہیں کی' جبکہ حضور اکرمﷺ نے گیارہ شادیاں کیں اور کنیزیں ان کے علاوہ تھیں۔ چنانچہ اس حوالے سے ان کے لیے تو کوئی نہ کوئی عذر موجود ہے' لیکن ہمارے ہاں اس کے باوجود اگر رَہبانیت کا نظام آیا ہے تو یہ بہرحال زیادہ قابل مذمت ہے۔

عبادات میں حد سے زیادہ تعمق کے نتیجے میں سابقہ اُمت مسلمہ نہ صرف اپنی منزلِ مقصود سے ہٹ گئی بلکہ باوجود خلوص کے ربّ نے ان کی ان کاوشوں کو قابل اعتناء نہیں سمجھا۔ نبی کریمﷺ کا ارشاد مبارک ہے' جسے امام نسائی نے کتاب الایمان میں یوں نقل کیا ہے:

((اِنَّ هٰذَا الدِّيْنَ يُسْرٌ وَلَنْ يُشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاَبْشِرُوْا وَيَسِّرُوْا وَاسْتَعِيْنُوْا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِّنَ الدَّلْجَةِ))

''بلاشبہ یہ دین آسان ہے۔ اور کوئی شخص دین میں سختی نہ کرے گا مگر دین اس کو پچھاڑ دے گا۔ پس میانہ روی اختیار کرو اور قریب ہو جاؤ (یہ خیال مت کرو کہ تم اس قدر خدا سے دور ہو کہ بغیر اعمال شاقہ کے اُس تک نہیں پہنچ سکتے۔) امید اور سرورِ دل حاصل کرتے رہو' اور آسانی اختیار کرو' اور صبح و شام اور اخیر شب کے ایک حصہ سے مدد حاصل کرو (کہ ان اوقات میں رحمت الٰہی نازل ہوتی ہے اور دل نفسانی تذکروں سے خوب صاف ہوتا ہے)۔''

اس حدیث مبارکہ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اُمت مسلمہ کے افراد پر لازم ہے کہ وہ عبادات میں اعتدال پر مبنی رویّہ اپنائیں اور اس میں اتنی زیادتی نہ کریں کہ جس کا نبھانا مشکل ہو جائے' دینی امور مشتبہ ہو جائیں اور دنیاوی امور کے منافع بے کار ہو جائیں۔ ان امور کو آنحضورﷺ نے اشارتاً اور بعض جگہ پر صراحتاً بھی بیان کیا ہے۔ صحیح البخاری' کتاب القبلۃ میں ارشادِ نبویؐ ہے:

((اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَى اللّٰهِ اَدْوَمُهٗ وَاِنْ قَلَّ))

’’اللہ کو وہ اعمال زیادہ پسند ہیں جو ہمیشہ کیے جائیں‘ اگرچہ ان کی مقدار قلیل ہی کیوں نہ ہو۔‘‘

ان اعمال کی پسندیدگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عبادات میں مداومت اور مستقل مزاجی دل کی خواہش اور رغبت کو ظاہر کرتی ہے۔ نیز عبادات کا اثر انسانی نفس جب ہی قبول کرتا ہے جب وہ اس کے فائدے سے مستفیض ہوتا ہے‘ یعنی وہ اپنے کردار وافکار میں مثبت تبدیلیاں محسوس کرتا ہے اور روحانی ترقی اس کو عبادات کے لیے فرصت اور تخلیہ فراہم کرتی رہتی ہے۔ صحیح بخاری‘ کتاب الوضوء میں نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

((اِنَّ اَحَدَکُمْ اِذَا صَلّٰی وَھُوَ نَاعِسٌ لَا یَدْرِیْ اَوْ لَعَلَّہٗ یَسْتَغْفِرُ فَیَسُبُّ نَفْسَہٗ))

’’تم میں سے بعض لوگ سونے کی حالت میں نماز پڑھتے ہیں اور ان کو نہیں معلوم ہوتا کہ استغفار کے وقت اپنے نفس پر بددعا کرتے ہیں۔‘‘

مراد یہ ہے کہ جس حالت میں طاعت وغیر طاعت میں تمیز نہ رہتی ہو اُس عبادت سے نہ تو نفسانی تقاضے میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی روحانی ترقی وجود میں آئے گی۔ رات کے آخری حصہ میں انسان اگر تھوڑی سی عبادت کر لے تو وہ اس کے لیے انتہائی فائدہ مند اور رحمت الٰہی کا سبب بن سکتی ہے‘ کیونکہ اس وقت دل نفسانی تذکروں سے خالی اور صاف ہوتا ہے۔ اور مسلمانوں کے لیے تہجد کا تربیتی نظام اسی لیے رکھا گیا ہے۔ اگرچہ اس کو مسلمانوں پر فرض نہیں قرار دیا گیا مگر روحانی ترقی اور تعلق باری تعالیٰ کے ضمن میں یہ آزمودہ نسخہ ہے۔

اگر ہم اپنی عبادات میں وہ رویّہ اپنائیں جو ہمیں سیرتِ نبویؐ اور تعاملِ صحابہؓ سے ملتا ہے تو یقینی بات ہے کہ اپنی زندگی کے معاشی‘ معاشرتی‘ سیاسی اور دیگر تمام شعبوں میں دینی ذمہ داریوں کو ادا کرسکیں گے۔ دنیا کو آج جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ زندگی کے یہی تین شعبے ہیں جہاں انسان افراط وتفریط کا شکار ہے۔ جب تک ہم مسلمان اپنی ان ذمہ داریوں کو ادا نہیں کریں گے اور عبادات کے اہداف ومقاصد کو سامنے نہیں رکھیں گے اس وقت تک نہ تو اللہ کی رحمتیں ہم پر برسیں گی اور نہ ہی ہماری یہ دعائیں رنگ لائیں گی جن میں ہم اللہ تعالیٰ سے ترقی وعروج کی التجا کرتے ہیں۔ oo

مآخذ: ۱) حجۃ اللہ البالغہ‘ شاہ ولی اللہ دہلوی ۲) درس آیۃ البر اور سورۃ الحدید‘ ڈاکٹر اسرار احمد

اسلامی نظامِ زندگی

مسلمان کا طرزِ حیات (۴۴)

علامہ ابوبکر جابر الجزائری کی شہرۂ آفاق کتاب

''مِنھاجُ المسلم'' کا اردو ترجمہ

مترجم : مولانا عطاءاللہ ساجد

کتاب العبادات

آٹھواں باب

۸) اَذان اور اقامت

ا) اَذان:

۱) اذان کی تعریف : ''خاص الفاظ کے ساتھ نماز کا وقت شروع ہو جانے کی اطلاع دینا''۔

۲) اذان کا حکم : شہروں اور گاؤں والوں کے لیے اذان واجبِ کفایہ ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((فَاِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاۃُ فَلْیُؤَذِّنْ لَکُمْ اَحَدُکُمْ وَلْیَؤُمَّکُمْ اَکْبَرُکُمْ))[۱]

''جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے ایک شخص اذان دے اور تم میں زیادہ عمر والا نماز پڑھائے''۔

آبادی سے باہر رہنے والے اور مسافر کے لیے اذان کہنا مسنون ہے۔ جناب رسول اللہﷺ نے فرمایا:

---

۱) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافرین اذا کانوا جماعۃ والاقامۃ وکذلک۔ وصحیح مسلم، کتاب المساجد، باب من احق بالامامۃ۔

((فَاِذَا كُنْتَ فِیْ غَنَمِکَ اَوْ بَادِیَتِکَ فَاَذَّنْتَ بِالصَّلَاةِ فَارْفَعْ صَوْتَکَ بِالنِّدَاءِ، فَاِنَّـهٗ لَا یَسْمَعُ مَدَی صَوْتِ الْمُؤَذِّنِ جِنٌّ وَلَا اِنْسٌ وَلَا شَیْءٌ اِلَّا شَهِدَ لَـهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ))(۱)

''جب تو اپنی بکریوں میں ہو یا جب تو جنگل میں ہو اور نماز کے لیے اذان کہے تو بلند آواز سے اذان کہہ۔ پس مؤذن کی آواز جہاں تک پہنچتی ہے وہاں تک آواز سننے والا ہر جن اور انسان، بلکہ سب کچھ قیامت کے دن اُس کے حق میں گواہی دے گا۔''

۳) اذان کے الفاظ: جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو جو اَذان سکھائی تھی اس کے الفاظ یہ ہیں:

اَللّٰهُ اَکْبَرُ ، اَللّٰهُ اَکْبَرُ ، اَللّٰهُ اَکْبَرُ ، اَللّٰهُ اَکْبَرُ

''اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے''۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ، اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں''۔

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ

''میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں''۔

اس کے بعد مؤذن دوبارہ بلند آواز سے شہادتین کے الفاظ دہرائے۔ اسے ترجیع کہتے ہیں۔ اس کے بعد کہے:

حَیَّ عَلَی الصَّلَاةِ، حَیَّ عَلَی الصَّلَاةِ

''نماز کی طرف آؤ! نماز کی طرف آؤ!''

حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ ، حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ

''کامیابی کی طرف آؤ! کامیابی کی طرف آؤ!''

فجر کی اذان میں دوبار یہ الفاظ بھی کہے:

اَلصَّلَاةُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اَلصَّلَاةُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ

---

۱) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب رفع الصوت بالنداء۔

''نماز نیند سے بہتر ہے' نماز نیند سے بہتر ہے۔''

اس کے بعد کہے:

اَللّٰہُ اَکْبَرُ ' اَللّٰہُ اَکْبَرُ

''اللہ سب سے بڑا ہے' اللہ سب سے بڑا ہے''۔

لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ

''اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں''۔

اس کی دلیل حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے اس طرح اذان سکھائی: اَللّٰہُ اَکْبَرُ' اَللّٰہُ اَکْبَرُ ' اَللّٰہُ اَکْبَرُ ' اَللّٰہُ اَکْبَرُ' اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ' اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ' اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ' اَشْھَدُ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ (پھر دوبارہ کہے) اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ (دومرتبہ) اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ (دومرتبہ)۔ اگر صبح کی نماز ہو تو یوں کہے: اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِنَ النَّوْمِ' اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ[1] اَللّٰہُ اَکْبَرُ ' اَللّٰہُ اَکْبَرُ ' لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ[2]

۴) مؤذّن کی صفات: بہتر ہے کہ مؤذن دیانت دار' بلند آواز اور نمازوں کے اوقات سے بخوبی واقف ہو۔ وہ کسی بلند جگہ (مثلاً مینار وغیرہ) پر کھڑے ہو کر اذان کہے۔ اذان کے دوران کانوں میں انگلیاں ڈالے اور حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ' حَیَّ عَلَی الْفَلَاح کہتے ہوئے دائیں طرف اور بائیں طرف مُنہ پھیرے۔ اذان کی اجرت وصول نہ کرے' مگر سرکاری خزانے سے یا اوقاف سے لے سکتا ہے۔

ب) اقامت:

۱) اقامت کا حکم: اقامت پانچوں فرض نمازوں میں سے ہر ایک کے لیے سنتِ

---

۱) "اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِنَ النَّوْمِ" کے الفاظ کو تثویب کہتے ہیں' یعنی دوبارہ بلانا۔ مؤذن پہلے "حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ" کے الفاظ سے نماز کی طرف بلاتا ہے' پھر "اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِنَ النَّوْمِ" کہہ کر دوبارہ نماز کی دعوت دیتا ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''مجھے رسول اللہ ﷺ نے فجر کے وقت تثویب کا حکم دیا''۔ مسند احمد۔

۲) سنن ابی داوٗد' کتاب الصلاۃ' باب کیف الاذان۔ وسنن النسائی' کتاب الاذان' باب کیف الاذان۔ و سنن ابن ماجہ' کتاب الاذان' باب الترجیع فی الاذان۔ وجامع الترمذی۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq july05\minhaj34.inp 8/22/2014 4:33 PM PAGE 2 (1,1)

واجب ہے‘ اگرچہ وہ فوت شدہ نماز ہی ہو۔ فرمانِ نبویؐ ہے:

((مَا مِنْ ثَلَاثَةٍ فِیْ قَرْیَةٍ وَلَا بَدْوٍ لَا تُقَامُ فِیْهِمُ الصَّلَاةُ اِلَّا قَدِ اسْتَحْوَذَ عَلَیْهِمُ الشَّیْطَانُ‘ فَعَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَةِ‘ فَاِنَّمَا یَاْکُلُ الذِّئْبُ الْقَاصِیَةَ))(۱)

''کسی بستی یا ڈیرے میں اگر تین آدمی ہوں اور اُن میں نماز باجماعت قائم نہ کی جاتی ہو تو شیطان اُن پر غلبہ پا لیتا ہے۔ اس لیے جماعت کو اختیار کرو۔ بھیڑیا اُسی بکری کو کھاتا ہے جو (ریوڑ سے الگ ہو کر) دُور چلی جاتی ہے''۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا تھا کہ اذان کے کلمات دو دو بار اور اقامت کے کلمات ایک ایک بار کہیں''۔ (۲)

۲) اقامت کے الفاظ: حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں جنہیں خواب میں اذان سکھائی گئی تھی۔ اُن سے اقامت اِن الفاظ میں مروی ہے:

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ

''اللہ سب سے بڑا ہے‘ اللہ سب سے بڑا ہے''۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰہُ

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں''۔

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ

''میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں''۔

حَیَّ عَلَی الصَّلَاةِ

''نماز کی طرف آؤ''۔

حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ

''کامیابی کی طرف آؤ''۔

قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ‘ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ

''نماز کھڑی ہو گئی‘ نماز کھڑی ہو گئی''۔

---

۱) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الصلاة‘ باب فی التشدید فی ترک الجماعة۔ وسنن النسائی‘ کتاب الامامه‘ باب التشدید فی ترک الجماعة۔ ومسند احمد۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

۲) صحیح مسلم‘ کتاب الصلاة‘ باب الامر بشفع الاذان وایتار الاقامة۔ وصحیح البخاری‘ کتاب الاذان‘ باب الاذان مثنی مثنی۔

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ

''اللہ سب سے بڑا ہے' اللہ سب سے بڑا ہے''۔

لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ[1]

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں''۔

ایک مسئلہ : اقامت پر امام کا حق زیادہ ہے' یعنی مؤذن کو امام کے آ جانے پر اس کی اجازت سے اقامت کہنی چاہیے۔ حدیث میں ہے : ((اَلْمُؤَذِّنُ اَمْلَکُ بِالْاَذَا وَالْاِمَامُ اَمْلَکُ بِالْاِقَامَۃِ))[2] ''اذان پر مؤذن کا زیادہ اختیار ہے اور اقامت پر امام کا اختیار زیادہ ہے''۔ اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے' اس لیے یہ حدیث ضعیف ہے۔ تاہم اکثر فقہاء کا عمل اس کے مطابق ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اسی مفہوم کی ایک حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ ان کے نزدیک اُس حدیث کی وجہ سے اِس حدیث کو بھی تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔ البتہ اَذان کے متعلق مؤذن زیادہ اختیار رکھتا ہے' لہٰذا وقت ہو جانے پر اُسے اذان کہہ دینی چاہیے' اسے امام یا کسی اور سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں' نہ کسی کا انتظار کرنے کی ضرورت ہے۔

اذان سے متعلق مندرجہ ذیل امور مستحب ہیں:

۱) اذان کے الفاظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کیے جائیں اور اقامت کہنے میں تیزی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

((اِذَا اَذَّنْتَ فَتَرَسَّلْ فِیْ اَذَانِکَ وَاِذَا اَقَمْتَ فَاحْدُرْ))[3]

''جب تو اذان کہے تو ٹھہر ٹھہر کر کہہ اور جب اقامت کہے تو جلدی جلدی کہہ''۔

۲) جب اذان یا اقامت ہو رہی ہو تو سننے والا بھی اپنے مُنہ میں وہی الفاظ دہراتا جائے جو اَذان یا اقامت کہنے والا کہہ رہا ہو۔ البتہ ''حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ'' اور ''حَیَّ عَلَی

---

۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الصلاۃ' باب کیف الاذان۔

۲) جامع الترمذی' ابواب الصلاۃ' باب ما جاء ان الامام احق بالاقامۃ۔ امام ترمذی نے یہ جملہ حدیث کے طور پر ذکر نہیں کیا' بلکہ فرمایا ہے ''بعض علماء کا یہ قول ہے کہ مؤذن اذان کا زیادہ اختیار رکھتا ہے اور امام اقامت کا زیادہ اختیار رکھتا ہے''۔

۳) اس حدیث کو ابوالشیخ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے۔ جامع الترمذی' کتاب الصلاۃ' باب ما جاء فی الترسل فی الاذان۔

الْفَلَاحِ'' کے جواب میں کہے: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (اللہ کی توفیق کے بغیر نہ برائی سے بچنے کی طاقت ہے نہ نیکی کرنے کی قوت)۔اسی طرح ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ'' (نماز کھڑی ہوگئی) کے جواب میں کہے: اَقَامَهَا اللّٰهُ وَاَدَامَهَا (اللہ تعالیٰ اسے قائم ودائم رکھے)۔اس کی دلیل سنن ابی داؤد کی حدیث ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اقامت کہی۔جب انہوں نے قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ کہا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:((اَقَامَهَا اللّٰهُ وَاَدَامَهَا)) (۱)

صحیح مسلم میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد مروی ہے۔آپؐ نے فرمایا:

((اِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُوْلُوْا مِثْلَ مَا يَقُوْلُ، ثُمَّ صَلُّوْا عَلَيَّ ، فَاِنَّهٗ مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ صَلَاةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ بِهَا عَشْرًا ، ثُمَّ سَلُوا اللّٰهَ لِيَ الْوَسِيْلَةَ فَاِنَّهَا مَنْزِلَةٌ فِي الْجَنَّةِ لَا تَنْبَغِيْ اِلَّا لِعَبْدٍ مِّنْ عِبَادِ اللّٰهِ، وَاَرْجُوْ اَنْ اَكُوْنَ اَنَا هُوَ، فَمَنْ سَاَلَ لِيَ الْوَسِيْلَةَ حَلَّتْ لَهُ الشَّفَاعَةُ))(۲)

''جب تم مؤذن (کی اذان) کو سنو تو خود بھی اسی طرح کہو جس طرح مؤذن کہتا ہے۔پھر مجھ پر درود پڑھو۔پس جو شخص مجھ پر ایک بار درود پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتے ہیں۔پھر میرے لیے اللہ سے ''وسیلہ'' کی دعا کرو۔وہ جنت کا ایک درجہ ہے جو اللہ کے بندوں میں سے صرف ایک ہی بندے کے لائق ہے۔مجھے امید ہے کہ وہ بندہ میں ہی ہوں گا۔پس جو شخص اللہ سے میرے لیے ''وسیلہ'' کی

---

۱) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب ما یقول اذا سمع الاقامۃ۔

۲) صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب استحباب القول مثل قول المؤذن لمن سمعہ ثم یصلی علی النبی (ﷺ) ثم یسأل اللہ لہ الوسیلۃ۔ **اذان سن کر وسیلہ مانگنے کا طریقہ: صحیح بخاری میں مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اَذان سن کر یہ دعا پڑھے قیامت کے دن اس کے لئے میری شفاعت حلال ہو جائے گی:** اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ آتِ مُحَمَّدًا الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا الَّذِيْ وَعَدْتَّهٗ **''اے اللہ! اے اس مکمل بلاوے اور قائم رہنے والی نماز کے مالک! محمد ﷺ کو وسیلہ اور فضیلت عطا فرما اور آپؐ کو اُس مقامِ محمود پر فائز کر جس کا تو نے حضور ﷺ سے وعدہ فرمایا ہے''۔(صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب ما یقول اذا سمع المنادی)**

نوٹ: ''مقامِ محمود'' سے وہ مقام مراد ہے جہاں حضور علیہ السلام قیامت کے دن ''شفاعتِ کبریٰ'' فرمائیں گے اور ''وسیلہ'' جنت کا اعلیٰ ترین مقام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے افضل ترین بندے کے لیے خاص کیا ہے۔

دعا کرے گا اس کو میری شفاعت نصیب ہوگی۔''

۳) اذان کے بعد بھلائی کی دعا مانگنا۔ امام ترمذی نے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد روایت کیا ہے کہ:

((اَلدُّعَاءُ لَا یُرَدُّ بَیْنَ الْاَذَانِ وَالْاِقَامَةِ))(۱)

''اذان اور اقامت کے درمیان دعا رد نہیں ہوتی''۔

مغرب کی اذان کے وقت یہ دعا بھی حدیث نبویؐ میں مذکور ہے:

((اَللّٰھُمَّ اِنَّ ھٰذَا اِقْبَالُ لَیْلِکَ وَاِدْبَارُ نَھَارِکَ وَاَصْوَاتُ دُعَاتِکَ فَاغْفِرْلِیْ))(۲)

''اے اللہ! یہ تیری رات کے آنے اور دن کے جانے کا' اور تیری طرف پکارنے والوں کی آوازوں کا وقت ہے' پس تو مجھے بخش دے''۔

۹) مسافر کی نماز' دو نمازیں ملا کر پڑھنا' مریض کی نماز اور حالتِ خوف کی نماز کے مسائل

(ا) مسافر کی نمازِ قصر:

۱) قصر کا مفہوم: قصر کا مطلب یہ ہے کہ مسافر چار رکعت والی نماز کے بجائے دو رکعت ادا کرے۔ ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ اور کوئی دوسری سورت پڑھے۔ مغرب اور فجر کی نماز قصر نہیں کی جاتی۔ مغرب کی تین ہی رکعتیں ادا کی جاتی ہیں اور فجر کی حسبِ معمول دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں۔

۲) قصر کا حکم: نماز میں قصر قرآن مجید سے بھی ثابت ہے اور حدیث نبویؐ سے بھی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ

---

۱) جامع الترمذی' کتاب الصلاۃ' باب ما جاء فی ان الدعاء لا یرد بین الاذان والاقامۃ۔ امام ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

۲) سنن ابی داوٗد' کتاب الصلاۃ' باب ما یقول عند اذان المغرب۔ وجامع الترمذی' کتاب الدعوات' باب دعا ء اُم سلمۃ۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

الصَّلٰوةِ﴾ (النساء: ۱۰۱)

''جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی حرج نہیں کہ نماز قصر کر لو۔''

جناب رسول اللہ ﷺ سے نمازِ قصر کے متعلق سوال کیا گیا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَهٗ))(۱)

''یہ صدقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کیا ہے' تو اللہ کا صدقہ قبول کرو۔''

چونکہ آنحضرت ﷺ نے قصر پر مداومت فرمائی ہے لہٰذا اسے سنت مؤکدہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آنحضور ﷺ نے جو سفر بھی کیا اُس میں خود بھی اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی نمازِ قصر ہی ادا فرمائی۔

۳) **قصر کی مسافت:** جناب رسول اللہ ﷺ نے قصر کے لیے کسی خاص مسافت کا تعین نہیں فرمایا۔ صحابہ کرام' تابعین عظام اور ائمہ اسلام نے جناب رسول اللہ ﷺ کے مختلف سفر دیکھ کر آراء قائم کی ہیں۔ اکثر علماء نے چار برد یعنی اڑتالیس عربی میل وہ کم از کم مسافت قرار دی ہے جس کے سفر سے قصر کرنا مسنون ہے۔ چنانچہ جو شخص اتنے فاصلے کا سفر کرے اور اس کا سفر کسی گناہ اور معصیت کے لیے نہ ہو' اس کے لیے سنت یہ ہے کہ ظہر' عصر اور عشاء میں چار رکعت کے بجائے دو رکعت فرض ادا کرے۔

۴) **قصر کی ابتدا اور انتہا:** مسافر جب اپنے شہر کے مکانات سے آگے نکل جائے تو قصر نماز پڑھ سکتا ہے۔ اور وہ اُس وقت تک قصر کرتا رہے گا جب تک اپنے شہر میں واپس نہیں آ جاتا۔ ہاں' اگر وہ کسی مقام پر چار دن یا زیادہ ٹھہرنے کی نیت کر لے تو وہاں اسے پوری نماز پڑھنی چاہیے' قصر نہ کرے۔☆ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مسافر اقامت کی نیت کر لیتا ہے تو اسے دلی سکون اور اطمینان حاصل ہو جاتا ہے' اس طرح وہ سبب ختم ہو جاتا ہے جس کی بنا پر قصر کا حکم دیا گیا تھا اور وہ سبب ہے سفر کے معاملات میں دل کا مشغول رہنا اور سفر کی پریشانی۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے تبوک کے مقام پر بیس دن قیام فرمایا تھا اور نماز قصر کرتے رہے تھے۔(۲) اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے وہاں مقیم ہونے کا ارادہ نہیں فرمایا تھا۔

---

۱) صحیح البخاری۔ وصحیح مسلم' کتاب صلاة المسافرین وقصرها' باب صلاة المسافرین وقصرها۔

☆ واضح رہے کہ احناف کے ہاں پندرہ دن یا اس سے زیادہ قیام کی نیت پر نماز پوری پڑھنی ہوگی۔

۲) مسند احمد۔

۵) سفر میں نفل نماز: سفر کے دوران سنت مؤکدہ اور دیگر تمام نوافل چھوڑے جا سکتے ہیں۔ البتہ فجر کی سنتیں اور وتر کی نماز ترک کرنا بہتر نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: ''اگر مجھے سنتیں پڑھنا ہوتیں تو میں فرض نماز ہی پوری پڑھ لیتا۔'' (۱)

اسی طرح مسافر کے لیے، جس قدر چاہے، نوافل پڑھنا بلا کراہت جائز ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے سفر کے دوران نمازِ ضحیٰ کی آٹھ رکعتیں پڑھی تھیں۔ (۲) اس کے علاوہ آنحضور ﷺ سفر کے دوران راستے میں سواری کی پشت پر نفل پڑھ لیا کرتے تھے۔ (۳)

۶) قصر کرنا ہر مسافر کے لیے مسنون ہے: قصر کے مسئلہ میں پیدل سفر کرنے والے اور سواری پر راستہ طے کرنے والے مسافر کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح اونٹ پر سوار ہو کر سفر کرنے والا اور کار یا ہوائی جہاز سے سفر کرنے والا برابر ہیں۔ البتہ بحری جہاز پر سفر کرنے والا ملاح جو ہمیشہ جہاز ہی پر رہتا ہو اور جہاز پر ہی اس کے اہل وعیال موجود ہوں، اس کے لیے وہ جہاز گھر کے حکم میں ہے، لہٰذا اس کے لیے قصر کرنا مسنون نہیں، بلکہ اسے پوری نماز ادا کرنی چاہیے۔

ب) جمع بین الصلاتین (دو نمازیں ملا کر پڑھنا):

۱) نمازیں جمع کرنے کا حکم: دو نمازیں ایک وقت میں پڑھنا ایک جائز رخصت ہے، البتہ عرفہ کے دن عرفات کے میدان میں ظہر اور عصر کو اکٹھا پڑھنا اور مزدلفہ کی شب مغرب اور عشاء کی نمازیں مزدلفہ میں ملا کر پڑھنا لازمی سنت ہے، جسے چھوڑنا جائز نہیں۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے میدانِ عرفات میں ظہر اور عصر کی نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں سے ادا فرمائیں، اس کے بعد جب مزدلفہ پہنچے تو وہاں مغرب اور عشاء کی نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں سے ادا فرمائیں۔ (۴)

۲) اس کا طریقہ: نمازیں جمع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مسافر جمع تقدیم کے طریقے

---

۱) صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین وقصرها، باب صلاة المسافرین وقصرها۔

۲) فتح مکہ کے دن آنحضرت ﷺ نے حضرت اُم ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر میں ضحیٰ کے وقت آٹھ رکعت نماز ادا کی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ مکہ میں آپؐ مسافر تھے۔ دیکھیے صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین، باب استحباب صلاة الضحی..... الخ۔

۳) صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین، باب جواز صلاة النافلة علی الدابة فی السفر حیث توجهت۔

٤) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی ﷺ۔

سے ظہر اور عصر کی دونوں نمازیں ظہر کے اوّل وقت میں پڑھ لے' یا ظہر اور عصر دونوں کو عصر کے اوّل وقت میں جمع تأخیر کے طریقے پر ادا کر لے۔ اسی طرح مغرب اور عشاء کو جمع تقدیم کے طور پر مغرب کے وقت یا جمع تأخیر کے طور پر عشاء کے وقت پڑھ لے۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تبوک میں ایک دن نماز میں تأخیر فرمائی' پھر (خیمہ سے) باہر تشریف لائے اور ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی ادا فرمائیں۔ اس کے بعد باہر تشریف لائے تو مغرب اور عشاء کی نمازیں اکٹھی ادا فرمائیں۔ یہ اُس وقت ہوا جب آپ ﷺ جہاد کے لیے تبوک کے مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ (۱)

اسی طرح بستی میں رہنے والوں کے لیے بھی جائز ہے کہ جب رات کے وقت بارش' یا سخت سردی یا تیز آندھی کا عذر ہو اور عشاء کی نماز کے لیے دوبارہ مسجد میں آنا دشوار ہو تو مسجد میں مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کر کے پڑھ لیں' کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بھی بارش والی رات میں مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کر کے ادا کی تھیں۔ (۲)

اگر مریض کو ہر نماز اپنے اپنے وقت پر ادا کرنے میں مشقت ہو تو وہ بھی ظہر اور عصر کو ملا سکتا ہے اور مغرب اور عشاء کو ملا کر پڑھ سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمع کی علت مشقت ہے' جب بھی مشقت پائی جائے گی نمازیں جمع کرنا جائز ہوگا۔ بعض اوقات سفر کے بغیر بھی مسلمان کو ایسی سخت حاجت پیش آ سکتی ہے' مثلاً جان' مال یا عزت کا خوف' جس کی وجہ سے اُس کے لیے نمازیں جمع کر کے ادا کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک بار بغیر سفر کے اور بغیر بارش کے نمازیں ملا کر پڑھی تھیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ صَلّٰی بِالْمَدِیْنَةِ سَبْعًا وَثَمَانِیًا' اَلظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ (۳)

''نبی ﷺ نے مدینہ میں سات رکعتیں اکٹھی اور آٹھ رکعتیں اکٹھی پڑھیں' یعنی ظہر اور عصر' اور مغرب اور عشاء''۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ ظہر کی نماز کو مؤخر کرے اور عصر کو جلدی اس کے اوّل وقت میں ادا کر لے۔ اسی طرح مغرب کو مؤخر کرے اور عشاء میں جلدی کر کے اوّل وقت میں ادا کر لے۔

---

۱) متفق علیه۔

۲) صحیح البخاری' کتاب المواقیت' باب تأخیر الظهر الی العصر۔

۳) صحیح البخاری' کتاب المواقیت' باب تأخیر الظهر الی العصر۔ وصحیح مسلم' کتاب صلاة المسافرین وقصرها' باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اِن دو دو نمازوں کے اوقات میں اشتراک ہے۔

ج) بیمار کی نماز:

اگر مریض سہارا لے کر بھی کھڑا نہ ہو سکتا ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھ لے' اگر بیٹھنے کی طاقت نہ ہو تو پہلو کے بل لیٹ کر پڑھے' اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو چت لیٹ کر قبلہ کی طرف پاؤں پھیلا کر نماز پڑھے۔ سجدے کے لیے رکوع سے زیادہ جھکے۔ اگر رکوع اور سجدہ کی طاقت نہ ہو تو اشارے کرے' لیکن نماز کسی حال میں بھی ترک نہ کرے۔ حضرت عمران بن حُصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''مجھے پھوڑے نکلے ہوئے تھے۔ میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے متعلق دریافت کیا' تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((صَلِّ قَائِمًا ' فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا' فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَعَلٰى جَنْبٍ))(۱)

''کھڑے ہو کر نماز پڑھو' اگر (کھڑے ہو کر) نہ پڑھ سکو تو بیٹھ کر (پڑھو)۔ اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو پہلو کے بل (لیٹ کر) نماز پڑھو''۔

د) نمازِ خوف:

۱) مشروعیت: نمازِ خوف کے مشروع ہونے کی دلیل اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے:

﴿وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ﴾ (النساء:۱۰۲)

''جب آپ (علیہ السلام) اُن میں موجود ہوں اور اُن کے لیے نماز قائم کریں تو اُن میں سے ایک گروہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور وہ لوگ اپنے ہتھیار لے لیں۔ پس جب وہ سجدہ کر لیں تو وہ آپ کے پیچھے سے ہٹ جائیں' اور دوسری جماعت (کے افراد) آ جائیں جنھوں نے نماز نہیں پڑھی' تو وہ آپ کے ساتھ نماز پڑھیں اور وہ اپنا بچاؤ اور اپنا اسلحہ لے لیں''۔

۲) سفر میں نمازِ خوف کا طریقہ: احادیث میں نمازِ خوف کے کئی طریقے بیان ہوئے ہیں۔ ان کا انحصار خوف کی شدت اور عدمِ شدت پر ہے۔ اگر مجاہدین وطن سے دور

---

۱) صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب اذا لم یطق قاعدا فعلی جنب۔

ہوں اور نمازِ خوف کا وقت آ جائے تو اس کا زیادہ مشہور طریقہ یہ ہے کہ لشکر کے دو حصے ہو جائیں' ایک گروہ دشمن کے سامنے دفاع کے لیے کھڑا رہے اور ایک گروہ امام کے پیچھے نماز کے لیے صف بنا لے۔ امام انہیں ایک رکعت پڑھائے۔ اس کے بعد امام کھڑا رہے اور اس گروہ کے افراد اپنی اپنی ایک رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیں۔ وہ جا کر دشمن کے مقابلے میں مشغول ہو جائیں اور دوسرا گروہ آ کر امام کے پیچھے کھڑا ہو جائے۔ امام انہیں بھی ایک رکعت پڑھائے۔ اس کے بعد امام بیٹھا رہے اور وہ افراد اٹھ کر دوسری رکعت اپنی اپنی پڑھ لیں۔ پھر امام اور یہ دوسرا گروہ اکٹھے سلام پھیریں۔

نمازِ خوف کے اس طریقہ کا ذکر حضرت قُتیبہ بن سعید رحمہ اللہ کی حدیث میں ہے۔ حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

اَنَّ طَائِفَةً صَفَّتْ مَعَهٗ وَطَائِفَةٌ وِجَاهَ الْعَدُوِّ ' فَصَلّٰى بِالَّتِىْ مَعَهٗ رَكْعَةً' ثُمَّ ثَبَتَ قَائِمًا' وَاَتَمُّوْا لِاَنْفُسِهِمْ ثُمَّ انْصَرَفُوْا فَصَفُّوْا وِجَاهَ الْعَدُوِّ' وَجَاءَ تِ الطَّائِفَةُ الْاُخْرٰى فَصَلّٰى بِهِمُ الرَّكْعَةَ الَّتِىْ بَقِيَتْ مِنْ صَلَا تِهٖ' ثُمَّ ثَبَتَ جَالِسًا وَاَتَمُّوْا لِاَنْفُسِهِمْ' ثُمَّ سَلَّمَ بِهِمْ (۱)

''ایک گروہ نے نبی ﷺ کے ساتھ صف باندھ لی اور ایک گروہ دشمن کے مقابل رہا۔ حضور ﷺ نے اس گروہ کو ایک رکعت پڑھائی جو آپؐ کے ساتھ تھا۔ پھر حضور ﷺ کھڑے رہے اور ان لوگوں نے خود ایک رکعت پوری کر لی اور چلے گئے اور دشمن کے مقابل صفیں باندھ لیں اور دوسرا گروہ آ گیا۔ حضور ﷺ نے ان لوگوں کے ساتھ اپنی باقی ماندہ رکعت پڑھائی۔ پھر حضور ﷺ بیٹھے رہے اور ان (صحابہ) نے خود نماز مکمل کر لی اور پھر آپؐ نے ان کے ساتھ سلام پھیرا''۔

۳) حضر میں نمازِ خوف: اگر جنگ کے دوران مجاہدین اپنے گھر سے اتنی دور نہ ہوں جتنے فاصلے پر نمازِ قصر ادا کی جاتی ہے تو پہلا گروہ امام کے ساتھ دو رکعتیں پڑھے اور دو رکعتیں اپنی اپنی پڑھ لیں۔ اس دوران امام کھڑا رہے۔ پھر دوسرا گروہ آ جائے۔ امام انہیں بھی دو رکعتیں پڑھائے اور بیٹھا رہے اور مقتدی دو دو رکعتیں خود پڑھ لیں' پھر امام ان کے ساتھ سلام پھیرے۔

۴) اگر جنگ کی شدت کی وجہ سے فوج کے دو حصے نہ کیے جا سکیں: اگر جنگ

---

۱) صحيح البخارى' كتاب المغازى' باب غزوة ذات الرقاع۔ وصحيح مسلم' كتاب صلاة المسافرين وقصرها' باب صلاة الخوف۔

شدید ہو جائے اور معروف طریقے سے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے نمازِ خوف ادا نہ کی جا سکے تو ہر مجاہد بغیر جماعت کے انفرادی طور پر نماز ادا کر لے' خواہ نماز کے دوران سوار ہو یا پیدل چل رہا ہو' خواہ قبلہ کی طرف مُنہ ہو یا نہ ہو' جس طرح ہو سکے اشارے سے نماز پڑھ لی جائے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا﴾ (البقرة:٢٣٩)

''پس اگر تمہیں خوف ہو تو پیدل یا سواری پر (نماز پڑھ لو)''۔

حدیث نبویؐ ہے:

((وَاِنْ كَانُوْا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَلْيُصَلُّوْا قِيَامًا وَّرُكْبَانًا))(١)

''اگر وہ اس سے بھی زیادہ (خطرہ کی حالت میں) ہوں تو کھڑے کھڑے یا سواریوں پر نماز پڑھ لیں''۔

اس حدیث میں جو ''اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ'' کے الفاظ ہیں' اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جب خوف کی شدت ہو اور معرکہ برپا ہو اور مجاہدین دشمنوں کے ساتھ گھمسان کی جنگ لڑ رہے ہوں۔

۵) دشمن کے تعاقب میں یا دشمن سے خائف: جو شخص دشمن کے تعاقب میں ہو اور اسے خطرہ ہو کہ نماز میں مشغول ہونے کی وجہ سے دشمن بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا' یا جس کے پیچھے دشمن لگا ہوا ہو اور اُسے خطرہ ہو کہ نماز کے لیے رکنے کی صورت میں دشمن اسے پکڑ لے گا' وہ جس حالت میں بھی ہو نماز پڑھ لے' خواہ چل رہا ہو یا بھاگ رہا ہو' خواہ اس کا مُنہ قبلہ کی طرف ہو یا کسی اور طرف ہو۔ قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے: ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا﴾ ''پس اگر تمہیں خوف ہو تو پیدل یا سواری پر (نماز پڑھ لو)''۔ حضرت عبداللہ بن انیس ؓ کو جناب رسول اللہ ﷺ نے ہذلی کی گرفتاری کے لیے بھیجا۔ وہ فرماتے ہیں: ''جب مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ میرے اور اس کے درمیان (تعاقب کا) سلسلہ طویل ہو جائے گا جس سے نماز میں تأخیر ہو جائے گی تو میں چلتے چلتے نماز پڑھنے لگا' اس کی طرف مُنہ کیے ہوئے ہی (رکوع اور سجدہ) اشارے سے ادا کرتا رہا' یہاں تک کہ میں اس کے قریب پہنچ گیا.....''(٢)

---

١) صحيح البخاری' كتاب الجمعة' باب صلاة الخوف رجالا وركبانا راجل قائم۔

٢) سنن ابی داؤد' كتاب الصلاة' ابواب صلاة الخوف ' باب صلاة الطالب۔

گوشہ خواتین

عیسائیت اور اسلام میں عورت کے مقام کا تقابل

تحریر: ڈاکٹر طاہرہ ارشد

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ جو قوم عروج پر ہو ترقی کے لحاظ سے تمام اقوام اُس کی پیروی کرنے لگتی ہیں۔ آج جس قدر تیزی سے مشرق کی عورت مغربی تہذیب کو اپنا رہی ہے وہ ناقابلِ فہم ہے۔ مغربی تہذیب کسی بھی لحاظ سے (ماسوائے ٹیکنالوجی) عروج پر نہیں' بلکہ اُن کا معاشرتی نظام تو بُری طرح زوال پذیر ہے۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مشرق کی عورت اپنی لاعلمی کی وجہ سے مغرب زدہ بننے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ کیوں نہ ہم اِس لاعلمی بلکہ جہالت کو دُور کرنے کی کوشش کریں! ذرا عورت کے اصل مقام کے بارے میں عیسائیت اور اسلام کی تعلیمات کا موازنہ کیجیے!

انجیل متی' باب ۱۹' آیت ۹ میں لکھا ہے:

''اور میں تم سے کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے اور دوسری سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی چھوڑی ہوئی سے بیاہ کرلے وہ بھی زنا کرتا ہے''۔

جبکہ سورۃ البقرۃ میں ارشادِ ربّانی ہے:

﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۳۲﴾

''اور جب تم طلاق دو عورتوں کو' پھر وہ پوری کرلیں اپنی عدت' تو انہیں نکاحِ ثانی کرنے سے مت روکو جب وہ راضی ہوں آپس میں دستور کے مطابق۔ یہ اُس کو

نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں سے ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور یومِ آخرت پر۔ یہی تمہارے لیے زیادہ ستھرا اور پاکیزہ ہے۔ اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے''۔

انجیل متی، باب ۱۹، آیت ۱۲ کے الفاظ ہیں:

''کیونکہ بعض خوجے ایسے ہیں جو ماں کے پیٹ ہی سے ایسے پیدا ہوئے، اور بعض خوجے ایسے ہیں جن کو آدمیوں نے خوجہ بنایا اور بعض خوجے ایسے ہیں جنہوں نے آسمان کی بادشاہی کے لیے اپنے آپ کو خوجہ بنایا۔ جو قبول کرسکتا ہے وہ قبول کرلے''۔

یعنی آسمانی بادشاہت میں داخلہ کے خواہش مند تبھی کامیاب ہوسکتے ہیں جب وہ عورت سے تعلق نہ رکھیں۔ آیئے دیکھیں قرآن مجید کیا کہتا ہے:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ (الروم)

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اُس نے تمہارے لیے پیدا کیے تمہاری جنس سے جوڑے (یعنی میاں بیوی)، تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو، اور اُس نے تمہارے درمیان محبت اور مہربانی پیدا کی۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔''

عورت کے مقام کو اور زیادہ اچھی طرح سے سمجھنے کے لیے ہم انجیل کی آیات کا جواب احادیث کے ذریعے دیتے ہیں۔ پہلے انجیل کی آیات ملاحظہ فرمائیں!

۱۔ کرنتھیوں، باب ۷:

(۱) ''مرد کے لیے اچھا ہے کہ عورت کو نہ چھوئے''۔ (آیت ۲)

(۲) ''اگر تیرے بیوی ہے تو اُس سے جدا ہونے کی کوشش نہ کر اور اگر تیرے بیوی نہیں تو بیوی کی تلاش نہ کر۔ لیکن تو بیاہ کرے بھی تو گناہ نہیں اور اگر کنواری بیاہی جائے تو گناہ نہیں مگر ایسے لوگ جسمانی تکلیف پائیں گے اور میں تمہیں بچانا چاہتا ہوں''۔ (آیات ۲۷، ۲۸)

(۳) ''پس میں یہ چاہتا ہوں کہ تم بے فکر رہو، بے بیاہا شخص خداوند کی فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح خداوند کو راضی کرے۔ مگر بیاہا ہوا شخص دنیا کی فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح اپنی بیوی کو راضی کرے۔ بیاہی اور بے بیاہی میں بھی فرق ہے۔ بے بیاہی خداوند کی فکر میں رہتی ہے تاکہ اس کا جسم اور روح دونوں پاک ہوں۔ مگر بیاہی ہوئی عورت دنیا کی فکر میں رہتی ہے کہ کس طرح اپنے شوہر کو راضی کرے''۔ (آیات ۳۲ تا ۳۴)

(۴) ''.....اور دل میں قصد کر لیا ہو کہ میں اپنی لڑکی کو بے نکاح رکھوں گا وہ اچھا کرتا ہے۔ پس جو اپنی کنواری لڑکی کو بیاہ دیتا ہے وہ اچھا کرتا ہے اور جو نہیں بیاہ دیتا وہ اور بھی اچھا کرتا ہے''۔ (آیات ۳۷ و ۳۸)

یہ تو تھیں انجیل کی تعلیمات جن کے مطابق عورت سے پرہیز ہی بہتر نظر آتا ہے۔ آیئے چند احادیثِ نبویہؐ کا مطالعہ کر کے دیکھیں کہ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کی نظر میں عورت کس مقام پر فائز ہے!

(۱) حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ہم سے فرمایا: ''اے جوان لوگو! تم میں سے جو استطاعت رکھے وہ نکاح کرے' اس لیے کہ نکاح آنکھوں کو نیچا کرتا ہے اور شرم گاہ کو (زنا سے) بچاتا ہے۔ اور جو شخص خرچ کی طاقت نہ رکھے وہ روزہ رکھے' کیونکہ روزہ اُس کی خواہشِ نفس کو ختم کر دے گا''۔ (صحیح مسلم' کتاب النکاح)

(۲) حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''(میرے دل میں) عورت اور خوشبو کی محبت ڈال دی گئی ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے''۔ (سنن نسائی)

(۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی شخص نکاح کر لیتا ہے تو وہ اپنا آدھا دین مکمل کر لیتا ہے' لہٰذا اسے چاہیے کہ باقی آدھے دین کے معاملے میں اللہ سے ڈرتا رہے''۔ (بیہقی)

(۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین آدمیوں کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے: (i) وہ غلام جس نے اپنے مالک سے آزادی کے لیے معاہدہ کیا اور وہ ادائیگی کی نیت رکھتا ہے۔ (ii) برائی سے بچنے کی نیت سے نکاح کرنے والا۔ (iii) اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا''۔ (سنن نسائی)

یہ بات ہم بخوبی جانتے ہیں کہ قرآن مجید تحریف شدہ آسمانی کتابوں کی تصحیح کرتا ہے۔ اب ہم کچھ مثالوں کے ذریعے دیکھتے ہیں کہ انجیل کی بات کس حد تک درست ہے۔

گلتیوں' باب ۵' آیت ۲۴ میں ہے:

''اور جو مسیح یسوع کے ہیں انہوں نے جسم کو اُس کی رغبتوں اور خواہشوں سمیت صلیب پر کھینچ دیا ہے''۔

اس بات پر قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq july05\ms04-06.inp 8/22/2014 4:34 PM PAGE 2 (1,1)

وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَرَهْبَانِیَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا
كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا ۚ فَاٰتَیْنَا
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾ (الحدید)

’’پھر ہم نے پے در پے اپنے رسول بھیجے‘ اور (اُن سب کے بعد) عیسیٰ ابن مریم کو مبعوث کیا اور ہم نے اسے دی انجیل‘ اور جن لوگوں نے اُس کی پیروی کی اُن کے دلوں میں ہم نے نرمی اور محبت ڈال دی اور ترکِ دنیا (کی رسم) خود انہوں نے ایجاد کر لی‘ ہم نے اُن پر یہ واجب نہ کی تھی‘ مگر (انہوں نے) اللہ کی رضا چاہنے کے لیے (اختیار کی) تو اُس کو نہ نباہ سکے جیسے اس کے نباہنے کا حق تھا‘ تو اُن میں سے جو لوگ ایمان لائے ہم نے ان کو اُن کا اجر دیا اور اکثر اُن میں سے نافرمان ہیں‘‘۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ آدم وحوا علیہما السلام کے جنت سے نکالے جانے کے بارے میں انجیل کیا کہتی ہے:

☆ پیدائش‘ باب ۳‘ آیت ۶:

’’عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لیے اچھا اور آنکھوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لیے خوب ہے تو اُس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور اُس نے کھایا‘‘۔

یعنی سارا الزام عورت حوا یعنی ’’Eve‘‘ پر ہے۔ اسی سے انہوں نے لفظ ’’evil‘‘ نکالا ہے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید اس موضوع پر تثنیہ کے صیغہ میں بات کرتا ہے۔ عربی کی ادنیٰ سی شُدبُد رکھنے والا شخص جانتا ہے کہ ’’هُمَا‘‘ کا صیغہ ’’دونوں‘‘ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَیٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَیْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا
هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۹﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّیْطٰنُ لِیُبْدِیَ
لَهُمَا مَا وٗرِیَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ
الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَیْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِیْنَ ﴿۲۰﴾ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ
لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿۲۱﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا
سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ
اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَا اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ

مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ (الاعراف)

''اور اے آدمؑ! تو اور تیری بیوی دونوں اِس جنت میں رہو، جہاں جس چیز کو تمہارا جی چاہے کھاؤ، مگر اِس درخت کے پاس نہ پھٹکنا، ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ پھر شیطان نے اُن (دونوں) کو بہکایا تا کہ ان کی شرم گاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں، اُن کے سامنے کھول دے۔ اس نے اُن سے کہا: تمہارے ربّ نے تمہیں جو اِس درخت سے روکا ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے، اور اس نے قسم کھا کر اُن سے کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔ اس طرح دھوکا دے کر وہ ان دونوں کو رفتہ رفتہ اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخر کار جب اُن دونوں نے اُس درخت کا مزا چکھا تو اُن کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔ تب ان کے ربّ نے انہیں پکارا ''کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہ روکا تھا اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟''

قرآن مجید میں یہی مضمون دیگر مقامات پر بھی تثنیہ کے صیغے میں ہی بیان ہوا ہے۔ انجیل (محرّف) میں عورت کے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوانے کی پاداش میں خدا کی طرف سے جو سزا تجویز کی گئی وہ مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

پیدائش، باب ۳، آیت ۱۶:

''پھر اُس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا۔ تو درد کے ساتھ بچے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا''۔

جبکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اپنے بعد ماں باپ کا شکر ادا کرنے کا ذکر کر رہے ہیں اور ماں کی تکلیف کا خاص طور سے ذکر ہوا ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۱۴﴾﴾ (لقمٰن)

''اور ہم نے تاکید کر دی انسان کو اُس کے ماں باپ کے بارے میں (حسنِ سلوک کی)۔ اُس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری جھیل کر اُسے پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اُس کا دودھ چھڑایا کہ میرا شکر کر اور اپنے ماں باپ کا، میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے''۔

عیسائی آدم وحوا علیہما السلام کے جنت سے نکالے جانے کو ''The Original Sin'' کا نام دیتے ہیں اور عورت ہی کو اِس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اُن کے عقیدے کے مطابق اس کے نتیجے میں نیکی کی قوت سلب کر لی گئی' خدا نے اپنی رحمت انسان سے اٹھالی اور انسان اس ایک گناہ کے ذریعے بے شمار گناہوں میں مبتلا ہو گیا۔ چونکہ اُن کی نظر میں عورت اس سارے عمل کی ذمہ دار تھی اس لیے عورت سے نفرت' بغض اور تعصب بھی دیگر گناہوں کے ساتھ ساتھ عیسائی مردوں کی فطرت میں شامل ہو گیا۔ نہ تو اُن کی فطرت یہ ماننے کو تیار تھی کہ وہ ازلی گناہ گار ہیں اور نہ ہی عورت جسے ''Eve'' کا خطاب دیا گیا' اس بات کو تسلیم کرنے کو تیار تھی کہ وہ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ نتیجتاً ان لوگوں نے جو خود کو عیسائی کہتے تھے' اپنے مذہب کی تعلیمات سے انحراف کیا اور عورت بھی اُس مذہب سے آزاد ہوتے ہوتے مادر پدر آزاد ہو گئی۔ اہل مغرب کی مصوری' مجسمہ سازی اور اُن کے ادب کا اگر آپ مطالعہ کریں تو عورت کے لیے گالیوں اور فحش کلمات کی بہتات ملے گی' جبکہ مسلم ادیبوں نے کائنات کے حسن میں عورت کے وجود کو لازم قرار دیا اور اُس کے لیے خوبصورت الفاظ واستعارات استعمال کیے۔

حقیقت یہ ہے کہ عیسائیت نے کبھی عورت کے مکمل وجود کو تسلیم ہی نہیں کیا اور اس سے تعلق کو ساوی بادشاہت میں داخلے کی واحد رکاوٹ قرار دے کر اسے معاشرے کی گری پڑی چیز بنا دیا۔ عورت کو کمتر اور گناہ کی جڑ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی معاشرے میں خواتین کی بے حرمتی' ہم جنس پرستی اور محرمات کے ساتھ مباشرت جیسے گھناؤنے اطوار مضبوطی سے جڑیں پکڑ گئے۔ خواتین کی عدم برداشت اور اُن کی مادرانہ شفقت اور فطری جذبات پر کڑی اور غیر ضروری پابندیوں نے عورت کے وجود کے خاکی اور روحانی دونوں حصوں کو بری طرح مجروح کیا۔ پہلے عورت کو برائیوں کی جڑ قرار دے کر ذلت کے گڑھوں میں دھکیل دیا گیا' پھر احساسِ ندامت کو کم کرنے کے لیے nuns کا ادارہ قائم کیا گیا جس کے ذریعے بے شک انہیں کچھ عزت ملی' لیکن وہ بھی اتنی بڑی قیمت ادا کر کے' یعنی غیر شادی شدہ ہونا شرط قرار پایا۔ عورت کی فطری شفقت اور ممتا کو دبا دیا گیا۔ عورت' جسے اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے عمل کے قابل بنایا' دنیا میں اُس کی اِس صلاحیت کی بے قدری کی گئی۔ آج مغرب کی عورت اپنی اِسی مادری شفقت کو کتوں بلیوں پر لٹاتی نظر آتی ہے۔ چرچ نے عورت کی اس قدر تحقیر کی ہے کہ مغربی عیسائی اب انسانی ازدواجی زندگی کے دائروں سے نکل کر بچوں اور جانوروں سے بدفعلی کرتے نظر آتے ہیں۔ ''Time'' کی ۳ جولائی ۱۹۹۵ء کی اشاعت کے مطابق عریاں رسالوں'

فحش فلموں اور کمپیوٹر پروگراموں کی مارکیٹ کا وسیع حصہ مغربی عیسائی خواتین کی کتوں سے مباشرت پر مبنی تصاویر پر مشتمل ہے۔ آج مغرب کی نفسیات اور بداعمالیوں کی وجہ وہ خرافات ہیں جنہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام منسوب کر کے الہامی کتابوں میں شامل کر دیا گیا۔

عورت کی آزادی: تاریخ کی نظر میں

۱۹۰۷ء میں نیویارک کی ملبوسات سازی کی صنعت سے وابستہ محنت کش خواتین نے پہلی بار خواتین کے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ اُن کا مطالبہ دس گھنٹے مسلسل کام کے بدلے اُن کی تنخواہوں اور سہولیات میں اضافہ اور اوقاتِ کار میں کمی وغیرہ کا تھا۔ لیکن اس کے جواب میں اُن خواتین کو پولیس کے تشدّد اور لاٹھی چارج کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح ۱۹۰۸ء میں سوئی سازی کی صنعت سے وابستہ خواتین کا بھی یہی انجام ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں عالمی کانفرنس نے عورتوں کا عالمی دن منانے کی سفارش کر دی جو ۱۹۵۶ء میں اقوام متحدہ نے مان لی اور ۸ مارچ عورتوں کا عالمی دن تسلیم کیا گیا۔ یہ بات ہمارے لیے ناقابل فہم ہے کہ ہمارا کیا واسطہ ہے اِس دن سے جو ہم مغرب کے حقوق کے علم بردار بن کر یہ دن منائیں؟

تشدّد، ناانصافی، مَردوں کا تعصب اور امتیازی رویے یقیناً دنیا بھر کی عورتوں کے اجتماعی مسائل ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ:

(۱) کیا سڑکوں پر آ کر مغرب کی عورت کو وہ سب کچھ مل گیا ہے جو وہ حاصل کرنا چاہتی تھی؟

(۲) کیا مسلمان عورتوں کے مسائل کی وجوہات وہی ہیں جو مغربی عورتوں کی ہیں؟

جہاں تک مغرب کی عورت کا تعلق ہے، وہ مذہب بیزار ہے۔ اُس کے ساتھ ظلم یہ ہوا ہے کہ وہ اپنے ساتھ برتے گئے مظالم اور مذہبی تحقیر کی زنجیر سے آزاد ہوتے ہوئے معاشی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دی گئی۔ فکری اور معاشی آزادی کے لیے مغربی عورت اپنے آپ کو بناسنوار کر رکھتی ہے۔ اب وہ اپنے حسن کا اظہار اپنے شوہر کے لیے نہیں بلکہ اُن مَردوں کے لیے کرتی ہے جنہوں نے چند کرنسی نوٹوں کے عوض انہیں معاوضے پر ملازم رکھا ہوتا ہے۔ یہ عورت اپنی معاشی آزادی کے لیے اپنی رضا و رغبت اور منشا سے اپنی عفت گنوا کر اُس پر فخر کرنا بھی سیکھ گئی ہے۔

مسائل مشرق کی عورت کے بھی بہت سنگین ہیں، لیکن اِن مسائل کی وجہ وہ نہیں جو مغرب کی عورت کی ہے۔ مغربی عورت کے برعکس ہم جب باہر نکلیں اور کوئی اوباش آوازہ کسے تو چپل اتار کر اُس کی وہ درگت بناتی ہیں کہ ہمیشہ یاد رہے۔ یہ نفسیات کا فرق کیوں ہے؟ اس کی

وجہ وہ احترام ہے جو ہم فطری طور پر مسلمان ہونے کے ناطے جانتی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں کے قدموں میں جنت رکھی ہے' بیٹیوں کی پرورش کرنے والے کو حضور اکرم ﷺ نے جنت میں اپنے ساتھ دو انگلیوں کی طرح جڑا ہوا بتایا ہے' بیوی کو بہترین متاع اور عورت کو نازک آبگینوں سے تشبیہہ دی ہے۔ ہادیٔ عالم ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے ہمیں وہ کچھ دے دیا جس کا آج بھی مغربی عورت تصور تک نہیں کر سکتی۔ مثلاً وراثت میں حصہ' روزی کمانے کی کٹھن ذمہ داری سے آزادی۔ اور آپ ﷺ نے نکاح آسان کر کے اور اس کی حدود بتا کر زنا کے تمام راستے بند کر دیے۔

مشرق کی عورت کو اُس کے حقوق کیوں نہیں ملے؟

سچی بات تو یہ ہے کہ مشرقی عورت نے اپنی اولاد کو اسلامی تعلیم و تربیت سے محروم رکھ کر اور مغربی تہذیب کو گلے لگا کر نہ صرف اُس پر بلکہ اپنے اوپر بھی بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو عورت ہی جہیز طلب کرتی نظر آتی ہے۔ بہو سے بدسلوکی کون کرتا ہے؟ عورت! ساس کے ساتھ بدسلوکی کر کے اپنی اولاد کے لیے بری مثال کون قائم کرتا ہے؟ عورت! حد سے بڑھی ہوئی نمائش پسندی' زیورات' ملبوسات' بدعات' سامانِ آرائش و زیبائش کی خواہش کون کرتا ہے؟ عورت! —— چنانچہ رشوت اور سود کی ذمہ دار عورت ہے۔ شوہر اگر تشدّد کرتا ہے تو اُس کی پرورش کس نے کی ہے؟ عورت نے! عورتوں کو گھروں سے نکلنے پر مجبور کس نے کیا؟ عورت نے! اور وہ اس طرح کہ اگر ہم خواتین درزنوں سے کپڑے سلواتیں تو وہ گھروں میں بیٹھ کر روزگار کماتیں' پٹرول پمپوں پر نہ کھڑی ہوتیں۔ ہم اپنے بیٹوں کے رشتوں کے لیے ڈاکٹر' انجینئر' ایم ایس سی لڑکیوں کی تلاش نہ کرتیں تو بچیاں پیشہ ورانہ تعلیم کے حصول کے بجائے گھروں کو سنوارتیں' لیکن ہم نے اُن کے نازک کندھوں پر دفتر کی ذمہ داری ڈال کر گھر کی ملکہ کو کلرک بنا دیا۔ صرف مصنوعی معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے بجائے اگر ہم عورتیں سادگی اختیار کرتیں تو مَردوں کے لیے حلال روزی کمانے کے زیادہ مواقع میسر آتے۔

اسلام نے قدرت رکھنے والے مرد کو ایک سے زائد شادیوں کی اجازت دی' لیکن پھر بھی کتنی ہی لڑکیاں غیر شادی شدہ بیٹھی ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ عورت اپنے شوہر کی تانک جھانک تو برداشت کر لیتی ہے' لیکن اسے دوسری شادی کی اجازت دے کر کسی لڑکی کو اچھی زندگی گزارنے کا موقع دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

کیا مرد کے لیے ڈوب مرنے کا مقام نہیں کہ وہ اپنی پوری زندگی بیوی سے مانگے ہوئے برتن' بستر اور فرنیچر استعمال کرتے ہوئے گزار دیتا ہے! جہیز کی بے غیرتی کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کی بے دین ماں!

نہ تو عورت کو کتاب وسنت کی تعلیم دی جاتی ہے اور نہ ہی اسے اسلامی عبادات و معاملات کے بارے میں بتلایا جاتا ہے۔ نہ وہ پاکی و ناپاکی کے مسائل جانتی ہے نہ نماز' روزہ اور زکوٰۃ کے مسائل کا اسے علم ہوتا ہے۔ اسے اسلامی اخلاق نہیں سکھائے جاتے۔ چنانچہ اُس کی زندگی غیبت' چغلی' قطع رحمی اور زبان کے غلط استعمال جیسے برے اخلاق میں گزر جاتی ہے۔

عورت کے سرپرست پر لازم ہے کہ وہ اسے علمِ دین سے روشناس کرائے' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ترغیب دے اور گھر کا ماحول ایسا بنائے کہ وہاں عبادت و اطاعت آسان اور فسق وفجور مشکل ہو' لیکن گھر کا سرپرست یہ سب کچھ تبھی کر سکے گا جب اُس کی ماں نے اسے سکھایا ہوگا۔

Cat Stevens جسے ہم یوسف اسلام کے اسلامی نام سے جانتے ہیں' جب اس سے اسلام قبول کرنے کے بعد پوچھا گیا کہ اسلام تو عورتوں کو قید کر کے رکھتا ہے اور اُن سے برا سلوک کرتا ہے' تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟ تو اُس نے جواب دیا: ''میں زیادہ کچھ نہیں جانتا' البتہ اتنا ضرور ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد میں اپنی والدہ کو اپنے پاس لے آیا ہوں اور ان کی خدمت کر کے سکون محسوس کرتا ہوں''۔

وہ دین جس کو اپنا کر غیر بھی ماں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں' ہم نے اس دین پر پیدا ہونے والے بچوں کو دین سے بے بہرہ رکھ کر اور مغرب کی تقلید سکھا کر خود کو اکیلا کر لیا ہے اور اُن کے دلوں سے اپنا احترام خود ہی کم کر دیا ہے۔

مشرق کی عورت کو کیا کرنا چاہیے!

اِس وقت میڈیا اور این جی اوز فحاشی اور بے راہ روی کو ہمارے گھروں تک لے آئے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ان اسباب کو دُور کریں جو خواتین کو دینِ اسلام سے دُور لے جا رہے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عورت کو اُس کے اسلامی حقوق وفرائض اور حدود وقیود کے بارے میں آگاہ کیا جائے' تاکہ دنیاداری کی جگمگاتی رنگینیاں اس کی معصوم آنکھوں کو چندھیا نہ سکیں' اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اپنے اوپر اسلام کی تعلیمات کو لازم کر لیں اور

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq july05\me04-06.inp 8/22/2014 4:34 PM PAGE 5 (1,1)

زندگی کے ہر گوشے کو اِس کے مطابق ڈھال لیں۔ تبھی یہ ممکن ہو گا کہ ہم اپنے بیٹوں کی تربیت صحابیات رضی اللہ عنہن کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کر سکیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ نظامِ خلافت کی جدوجہد میں عورتیں سب سے آگے ہوں‘ تاکہ اُن کے اجتماعی حقوق جو دین اسلام نے انہیں چودہ سو سال پہلے دیے تھے‘ عملی طور پر انہیں حاصل ہوں‘ لیکن حقوق حاصل کرنے کے لیے انہیں اپنے دینی فرائض پہلے ادا کرنے ہوں گے اور گھروں میں رہ کر اپنی ذمہ داریاں ادا کرنی ہوں گی‘ نہ کہ سڑکوں پر نکل کر یا مغرب کی پیروی کر کے۔ ○○

شادی بیاہ کی تقریبات میں سنّت کے مطابق اصلاح

بانیٔ تنظیم کے خطاب پر علماء کرام کے تہنیتی خطوط اور ان کے جواب

(۱)

بخدمت عالی شان جناب عالی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب حفظہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ وبعد:

طالب دعاءِ خیر بخیر وللہ الحمد۔

خلاصۃ المرام اینکہ الحمدللہ ماہنامہ ''میثاق'' و ماہنامہ ''حکمتِ قرآن'' کا مستقل قاری ہوں اور ہر ماہ اِن دونوں میں آپ کے چھپنے والے دروس کو شوق و رغبت سے پڑھنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ ماہنامہ میثاق کے پچھلے دو شماروں یعنی ماہِ اپریل و ماہِ مئی کے شماروں میں ''شادی بیاہ کی تقریبات میں سنت کے مطابق اصلاح'' ایک ایسا مضمون و مقالہ ہے جو ہر مصلح و محبّ سنت کے دل کی آواز ہے۔ ماہِ مئی کے شمارے میں جو نکاح کا خطبہ بیان کیا گیا ہے' تو یہ بات ظاہر کرتے ہوئے افسوس کا جذبہ غالب ہے کہ ہمارے سندھ کے اکثر نکاح خوان حضرات جن کو ''قاضی'' کہا جاتا ہے' نے اس عظیم خطبہ کو نسیاً منسیا کر دیا ہے اور نکاح خوانی کے وقت دولہا کو ایمان مفصل و ایمان مجمل پڑھا کر پھر جو ایک لمبی وطویل بنائی ہوئی دعا ہے' اس کو پڑھتے ہیں اور اسی کو اصل خطبہ سمجھا جاتا ہے اور ان کی تعمیل نہ کرنے والے کو حقارت و نکارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ الّا ماشاء اللہ!

جب آپ کا بیان کردہ نکاح کا خطبہ پڑھا تو اُن کے الفاظ میں کچھ کمی بیشی نظر آئی جس نے دستیاب کتب حدیث دیکھنے کا داعیہ پیدا کیا۔ کتب حدیث کے دیکھنے کی سعادت کے بعد یہ چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ لکھتے ہوئے اگرچہ احساس ہے کہ علم نہیں کم مائیگی ہے اور اردو کی عدم معرفت عبارت کے بنانے میں مخل ضرور ہے لیکن اصل مقصد و مدعا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی سنت واضح ہو جائے اور اسی سنت کی اتباع میں ہماری ہدایت و کامیابی

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq july05\ms20-06 nikah khatoot.inp 8/22/2014 4:37 PM PAGE 1 (1,1)

کا راز مضمر ہے۔

تو اب اصل مدعا کی طرف لوٹا جاتا ہے۔ آپ نے خطبہ کی ابتدا ''الحمد للّٰہ'' سے کی ہے' حالانکہ اکثر احادیث میں خطبہ کی ابتدا ''اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰہِ'' سے ہے۔ ہاں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ابنِ ماجہ کی روایت (ص ۱۳۶) سے ابتدا ''اَلحمدُ لِلّٰہ'' سے معلوم ہوتی ہے۔ اور آپ نے ''ونَستَغْفِرہ'' کے بعد ''ونَتَوَکَّل علیہ'' کے الفاظ زیادہ کیے۔ بندۂ پُرتقصیر کو دستیاب کتب حدیث جیسے سنن ترمذی' ص۲۰۱' ج ۱' سنن النسائی' ص ۸۷' ج ۲' سنن ابی داوٗد' ص۲۹۶' ج ۱' سنن ابن ماجہ' ص ۱۳۶' مسند احمد' ص۵۱۰ و ۵۶۰' ج ۱' مرقات المفاتیح' شرح مشکٰوۃ المصابیح' ص۲۱۴' ج ۶' بلوغ المرام' ص ۳۶۵' حجۃ اللہ البالغہ' ص۲۷۹' ج ۲' جمع الفوائد' ص۵۷۲' ج ۲' اصول المنہج الاسلامی' ص۴۷۰' الوابل الصیب' ص ۵۷ میں سے کسی بھی ایک کتاب میں یہ الفاظ نہیں ملے۔ اس لیے آپ سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اگر یہ مذکورہ الفاظ کسی حدیث کی کتاب میں موجود ہیں تو مع حوالہ ہماری رہنمائی فرمائیں تاکہ حقیقت معلوم ہو۔ یشکر اللہ سعیکم اور آئندہ شمارے میں ان کا ذکر فرمائیں۔ ''ونعوذ باللہ من شرور انفسنا'' کے بعد ابن ماجہ' ص ۱۳۶ اور سنن الترمذی' ص۲۱۰' ج ۱ میں ''وسیئات اعمالنا'' کے الفاظ زیادہ ہیں۔ اگر اضافہ کر دیا جائے تو سنت سے ثابت شدہ ہیں۔ (ابن ماجہ میں من سیئات اعمالنا ہے جبکہ ترمذی میں بغیر ''مِنْ'' کے ہے) ''ومن یضللہ فلا ھادی لہ'' میں ''یضللہ'' کا لفظ صرف سنن ترمذی' ص۲۱۰' ج ۱ میں ہے' باقی کتب حدیث میں ''ومن یضلل'' (بغیر ضمیر) کے ہے۔

خطبہ کے آخر میں شہادتین کا ذکر ہے جو حقیقت میں اسلام کی جڑ اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے' لیکن کتب حدیث میں شہادتین مضارع' واحد متکلم کے صیغہ کے ساتھ ہے جبکہ آپ نے مضارع جمع متکلم یعنی ''ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد محمدا عبدہ ورسولہ'' ذکر فرمایا' جبکہ کتب حدیث میں ''اشھد ان لا الٰـہ الا اللّٰہ' وحد لا شریک لہٗ (صرف ابن ماجہ میں ''وحدہ لا شریک لہٗ کے لفظ ہیں) واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ'' کے لفظ ہیں' لہٰذا ہمیں آپ ﷺ کی اتباع میں جمع کے بجائے واحد کے لفظ سے شہادتین خطبۂ نکاح میں پڑھنا چاہیے۔

باقی سنن ابی داوٗد' ص۲۹۶' ج ۱ میں اس کے بعد ''ارسلہ بالحق بشیرا ونذیرا بین یدی الساعۃ' من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصمھا فانہ لا یضر الا نفسہ ولا

یضر اللّٰہ شیئا'' کے الفاظ زیادہ مذکور ہیں۔

آخر میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اور نبی کریم ﷺ کی پوری اُمت کو کتاب وسنت کی اطاعت واتباع کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

والسلام

خادم

نذیر احمد بن الحافظ عبدالحق چنڑ

امام وخطیب جامع مسجد عمر فاروق' ڈاک خانہ حیات پتافی

تحصیل میر پور ماتھیلہ' ضلع گھوٹکی' سندھ

جواب

مکرمی جناب مولانا نذیر احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سب سے پہلے تو میں اس بات پر آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ہمارے جرائد کا اس دقتِ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں' نیز ہماری کوششوں کو سراہتے بھی ہیں اور غلطیوں کی نشاندہی بھی فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو نصح وخیر خواہی کرنے پر اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین!

آپ نے ''اسلامی معاشرت'' کے عنوان سے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے مضمون کے حوالے سے جن امور کی طرف توجہ دلائی ہے ان کے ضمن میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

بلاشبہ خطبۂ مسنونہ میں ''ونتوکّل علیہ'' کے الفاظ نبی کریم ﷺ سے مرفوعاً نقل نہیں ہوئے' البتہ چونکہ اپنے مفہوم میں یہ عقیدہ کے مبادیات کے عین مطابق ہیں اس لیے بعض خطباء اور واعظین انہیں بھی حمد وثناء میں شامل کر لیتے ہیں۔ البتہ آپ نے درست نشاندہی فرمائی ہے کہ الفاظ وہی استعمال کرنا بہتر ہے جو نبی کریم ﷺ سے مرفوعاً نقل کیے گئے ہیں۔

جہاں تک شہادتین کو واحد متکلم کے بجائے جمع متکلم میں ادا کرنے کا معاملہ ہے تو اگرچہ احادیث میں یہ واحد متکلم کے صیغے میں آتی ہیں لیکن علماء کے مابین اس بات کو جائز سمجھا جاتا ہے کہ ادعیہ ماثورہ وغیرہ میں واحد کی بجائے جمع کا صیغہ اور جمع کی جگہ واحد کا صیغہ

استعمال کرلیا جائے۔ یہی قول شہادتین کے حوالے سے بھی ملتا ہے۔ البتہ مناسب یہی ہے کہ صیغوں کی تبدیلی بھی نہ کی جائے' تاہم جواز کی حد تک صیغوں کی تبدیلی درست ہے۔

خطبۂ مسنونہ کی باقی عبارت ابن ماجہ کی صحیح روایات سے ثابت ہے۔ یہ روایات حضراتِ عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس ؓ سے مروی ہیں۔ (صحیح سنن ابن ماجہ' جلد اول' ص ۳۱۹۔ علامہ ناصر الدین البانی)

میں ایک مرتبہ پھر اپنی طرف سے اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ہمارا رابطہ برقرار رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

والسلام

عاطف وحید

انچارج' شعبہ تحقیق اسلامی

(۲)

مکرمی ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بغیر کسی تمہید کے اصل مدعا کی طرف آتا ہوں۔ ماہنامہ ''میثاق'' کی اشاعت بابت اپریل ومئی ۲۰۰۵ء میں ''شادی بیاہ کی تقریبات میں سنّت نبویؐ کے مطابق اصلاح'' کے ضمن میں آپ کے پُرمغز مقالے طبع ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ اس گئے گزرے دور میں عامۃ المسلمین کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے قرآن وسنت کی روشنی میں اپنا موقف عام فہم انداز میں بڑی دلسوزی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

محترم! آپ کے متذکرہ بالا ہر دو مقالہ جات اپنی جگہ کامل اور مکمل ہیں اور بات مکمل طور پر سمجھ میں آئی ہے' تاہم احقر آپ سے گزارش کرتا ہے کہ جہاں آپ نے خطبہ نکاح' بارات کی لعنت' جہیز کی حقیقت اور دعوت ولیمہ مسنونہ کی ضرورت واہمیت پر بات کی ہے' اگر ہمارے ہاں مروّج ایجاب وقبول اور اس ضمن میں مروّجہ بدعات کے حوالے سے بھی قرآن و سنت کے احکامات بیان فرمادیں تو بہتوں کا بھلا ہوگا۔ احقر اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے ایک تقریب نکاح کا حال بیان کرتا ہے جس سے بات واضح ہو جائے گی۔ ہمارے مفتی قبلہ محترم محمد اویس خان ایوبی صاحب ماشاء اللہ مکہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل اور مدینہ یونیورسٹی میں

تدریسی فرائض سرانجام دیتے رہنے کی سعادت سے بہرہ مند ہیں۔ مطلب یہ کہ ماشاء اللہ عالم باعمل ہیں۔ ایک نکاح کے موقع پر جو یہاں میر پور آزاد کشمیر کے مضافات میں ہوا' سرکاری نکاح خوان جو ایک اَن پڑھ سے ''مولوی'' تھے' فارم نکاح وغیرہ پُر کر چکنے کے بعد دلہن سے ایجاب وقبول کی غرض سے لڑکی (دلہن) کے والد اور دیگر گواہوں کے ہمراہ اندر گھر میں جہاں دلہن بیٹھی تھی' جانے لگے تو مفتی صاحب نے مولوی صاحب (نکاح خوان) کو پکڑ لیا کہ حضرت! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ جب لڑکی کا والد زندہ موجود ہے اور وہ دلہن سے نکاح فارم پر دستخط کروا سکتا ہے تو آپ کا اندر زنان خانہ میں جانا چنداں ضروری نہیں' اور یہ کوئی شرطِ نکاح بھی نہیں۔ مفتی صاحب قبلہ نے اس کی حکمت بھی بتائی کہ ایسے موقعوں پر خواتین نے معمول سے زیادہ ہی آرائش وزیبائش کا اہتمام کیا ہوتا ہے' چنانچہ ''مولوی لوگ'' تانکی جھانکی کر کے گناہگار ہوتے ہیں وغیرہ۔

بہرحال آپ سے استدعا ہے کہ آپ ایجاب وقبول کے لیے مسنون طریقہ' لڑکی کا والد موجود ہو تو کیا پھر بھی لڑکی سے ایجاب وقبول ضروری ہے' کیا موجودہ فارم نکاح وغیرہ پہ دستخط ایجاب وقبول کے مترادف ہیں' وغیرہم معاملات پر اپنی عالمانہ رائے سے نواز کر عنداللہ مأجور ہوں۔ ایجاب وقبول اور نکاح وغیرہ کے سلسلہ میں ہمارے ہاں جو مذموم اور ہندوانہ رسوم ورواج فروغ پا چکے ہیں' ان کا قلع قمع نہ سہی' ان کے آگے شعوری بند باندھنے کے لیے آپ کی پُراثر تحریر یقیناً کام دکھائے گی۔ زیادہ آداب!

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
آپ کا خیر اندیش
بندۂ بندگانِ الٰہی
اعظم حسین گیلانی
میر پور۔ آزاد کشمیر

☆☆☆

محترم اعظم حسین گیلانی صاحب کے توجہ دلانے پر ہمارے شعبہ تحقیق اسلامی کے ریسرچ ایسوسی ایٹ حافظ محمد زبیر صاحب نے ''نکاح کا صحیح اور شرعی طریقہ کار'' کے عنوان سے ایک مضمون مرتب کیا ہے' جو آئندہ صفحات میں شائع کیا جا رہا ہے۔

نکاح کا صحیح اور شرعی طریقہ کار

حافظ محمد زبیر☆

اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کے اس سلسلہ کو برقرار رکھنے کے لیے نکاح کا حکم جاری فرمایا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ ﴾(النور:٣٢)

''اور اپنے میں سے بے نکاح مرد اور عورتوں کا نکاح کرو۔''

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کی بہت ساری ایسی احادیث ملتی ہیں جن میں مسلمانوں کو بالعموم اور نوجوانوں کو بالخصوص نکاح کی رغبت دلائی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ))(١)

''اے نوجوانوں کی جماعت! جو بھی تم میں سے نکاح کی استطاعت رکھتا ہو اسے چاہیے کہ نکاح کر لے''۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ثَلَاثَةٌ حَقٌّ عَلَى اللّٰهِ اِعَانَتُهُمْ : اَلْمُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالنَّاكِحُ يُرِيْدُ اَنْ يَّسْتَعْفِفَ وَالْمُكَاتِبُ يُرِيْدُ الْاَدَاءَ(٢)

''تین افراد ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر اُن کی مدد کو لازم قرار دیا ہے' اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا' اپنے آپ کو گناہ سے بچانے کے لیے نکاح کرنے والا اور

☆ ریسرچ ایسوسی ایٹ شعبہ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی لاہور

(١) صحيح ابن ماجه' كتاب النكاح' باب ما جاء فى فضل النكاح۔ وصحيح سنن ابى داوٗد' كتاب النكاح' باب التحريض على النكاح۔

(٢)حاكم و دارقطنى بحواله نيل الاوطار' جلد٦' ص ٢٢٦' محمد بن على بن محمد الشوكانى' دار الفكر بيروت۔

ایسا مکاتب (غلام جو کہ اپنے مالک سے معاہدہ کرلے کہ وہ اسے اتنی رقم ادا کرے گا جس کے بدلے میں مالک اس کو آزاد کردے گا) جو کہ ادائیگی کا ارادہ رکھتا ہو''۔

نکاح کی حکمت:

اسلام کا مقصد نکاح کے ذریعہ سے درج ذیل مقاصد کا حصول ہے:

۱) نکاح کے نتیجہ میں اعضائے تناسل کے ذریعہ سے نسل انسانی کی بقاء۔

۲) اپنی عزت کی حفاظت اور فطری خواہش پوری کرنے کے لیے مرد اور عورت کا رشتۂ ازدواج۔

۳) نسل انسانی کی تربیت اور زندگی کی بقاء کے لیے دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تعاون

۴) مؤدت اور محبت کے دائرہ میں مرد اور عورت کا ایسا باہمی تعلق جس سے دونوں کے حقوق کا تحفظ اور ایک دوسرے کا تعاون حاصل ہو۔ (۱)

شریک حیات کا انتخاب:

جب کوئی مسلمان اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے نکاح کا ارادہ کرلیتا ہے تو اس میں سب سے پہلا مرحلہ ایک اچھی شریکۂ حیات کا انتخاب ہے۔ شادی کے وقت عام طور پر لڑکی کے حسن و جمال، مال و دولت اور خاندان کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے حالانکہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((تُنْكَحَ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ: لِمَالِهَا، وَلِحَسَبِهَا، وَلِجَمَالِهَا، وَلِدِينِهَا، فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ)) (۲)

''عورت سے چار وجوہات کی بنیاد پر نکاح کیا جاتا ہے، اس کے مال کی وجہ سے، اس کے حسب نسب (خاندان) کی وجہ سے، اس کے حسن کی وجہ سے، اس کی دین داری کی وجہ سے۔ پس تم (عورت سے نکاح کے وقت) اس کی دین داری کو ترجیح دو''۔

اللہ کے رسول ﷺ نے نکاح میں اصل معیار دین داری کو بنایا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ایک عورت کتنی ہی مالدار یا حسین کیوں نہ ہو اگر وہ بداخلاق اور منہ پھٹ ہوگی تو وہ مرد کی

---

(۱) منهاج المسلم، فضيلة الشيخ ابوبكر جابر الجزائري، ص ٦١٣، ٦١٤

(۲) صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب الاكفاء في الدين۔ وصحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب استحباب نكاح ذات الدين۔

ساری زندگی اجیرن کر چھوڑے گی۔

لڑکی کے انتخاب کے بعد اگلا مرحلہ پیغامِ نکاح کا ہے۔ اس سلسلے میں سنت کے مطالعے سے درج ذیل اصول ہمارے سامنے آتے ہیں:

۱) منگنی پر منگنی کرنے کی ممانعت: اگر کسی مسلمان بھائی کے رشتے کی بات کہیں چل رہی ہو یا رشتہ طے پا چکا ہو تو وہاں اپنے رشتے کے لیے پیغام بھیجنا حرام ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا یَخْطُبُ الرَّجُلُ عَلٰی خِطْبَةِ اَخِیْهِ حَتّٰی یَنْکِحَ اَوْ یَتْرُکَ))(۱)

''کوئی مسلمان ایسی جگہ نکاح کا پیغام نہ بھیجے جہاں اس کے کسی دوسرے بھائی کے رشتے کی بات چل رہی ہو' یہاں تک کہ وہ اس سے نکاح کر لے یا اس کا خیال ترک کر دے''۔

۲) مخطوبہ (جس کو پیغامِ نکاح بھیجا ہے) کو ایک نظر دیکھنے کا بیان: مخطوبہ کو شادی سے پہلے ایک نظر دیکھنا جائز ہے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے:

اَنَّهٗ خَطَبَ امْرَاَةً فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ: ((اُنْظُرْ اِلَیْهَا فَاِنَّهٗ اَحْرٰی اَنْ یُّؤْدَمَ بَیْنَکُمَا))(۲)

''انہوں نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام بھیجا تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ''اس کو ایک نظر دیکھ لو۔ یہ تمہارے درمیان محبت میں اضافے کا باعث ہوگا''۔

اسلام میں منگنی کا تصور وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے' لیکن منگنی کے نام سے عجیب و غریب قسم کی بدعات اور خرافات مسلمان معاشرے میں عام ہو چکی ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱) منگنی کو باقاعدہ ایک رسم کے طور پر منانا (celebration)' اس میں دعوت کا اہتمام کرنا' ویڈیو بنوانا اور مرد و زن کا اختلاط۔

۲) لڑکے کا اپنی منگیتر کے ساتھ ملاقاتیں کرنا یا ٹیلی فون کرنا۔

ہاں اگر لڑکے والوں کی طرف سے اس موقع پر لڑکی کو کوئی انگوٹھی وغیرہ پہنا دی جائے یا کپڑوں کے کچھ جوڑے تحفہ کے طور پر بھیج دیے جائیں تو اس میں کوئی حرج والی بات نہیں ہے۔ اس سے بات ذرا زیادہ پختہ ہو جاتی ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب لا یخطب علی خطبة اخیه حتی ینکح او یدع۔

(۲) جامع الترمذی' کتاب النکاح عن رسول الله' باب ما جاء فی النظر الی المخطوبة۔

لوگ عام طور پر نکاح اور منگنی میں فرق نہیں کرتے' حالانکہ منگنی تو صرف لڑکی اور لڑکے والوں کے درمیان ایک عہد و پیمان کی حیثیت رکھتی ہے' جس کے مطابق دونوں فریق مستقبل میں نکاح کرنے کا عزم کرتے ہیں۔ بعض اوقات نکاح کی تاریخ وغیرہ منگنی کے موقع پر ہی طے ہو جاتی ہے اور بعض اوقات یہ بعد میں طے ہوتی ہے۔ بہرحال منگنی کے بعد نکاح کا مرحلہ آتا ہے۔

اب ہم قرآن وسنت کی روشنی میں نکاح کے صحیح طریقہ کار کو واضح کرتے ہیں:

نکاح کے لغوی معنی غالب آنے اور ایک چیز کو دوسری چیز سے ملانے کے ہیں۔(۱)

اس کی اصطلاحی تعریف یوں ہے:

عَقْدٌ بَيْنَ الزَّوْجَيْنِ يَحِلُّ بِهِ الْوَطْأُ(۲)

''زوجین کے درمیان ایسا معاہدہ جو کہ مباشرت کو حلال کر دے''۔

نکاح کے ارکان وشرائط

نکاح کے درج ذیل ارکان وشرائط ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی رہ جائے تو نکاح صحیح نہ ہوگا' بلکہ باطل یا فاسد ہوگا۔ اس لیے نکاح کے وقت اِن چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

(ا) ''ولی'' کا ہونا: دورانِ نکاح ''ولی'' کے حوالے سے فریقین کو درج ذیل باتوں کا دھیان رکھنا چاہیے:

۱) نکاح میں لڑکی کی طرف سے ولی کا ہونا ضروری ہے' جبکہ لڑکا اپنا ولی خود ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ))(۳) ''ولی کے بغیر کوئی نکاح نہیں ہوتا''۔

۲) عورت کا ولی اس کا باپ ہوگا۔ باپ کی عدم موجودگی میں سب سے قریبی عزیز یا بچی کے خاندان میں سے کوئی صاحب الرائے یا حاکم وقت ہوگا۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

((لَا تُنْكِحُ الْمَرْأَةُ اِلَّا بِاِذْنِ وَلِيِّهَا اَوْ ذِى الرَّاْىِ مِنْ اَهْلِهَا اَوِ السُّلْطَانِ))(٤)

---

(۱) القاموس المحیط' علامة مجد الدین فیروزآبادی' جلد اول' ص ۲۵٤۔

(۲) نیل الاوطار' محمد بن علی بن محمد الشوکانی' جلد٦' ص ۲۲۷'۲۲۸' دار الفکر بیروت۔

(۳) صحیح سنن ابی داؤد' کتاب النکاح' باب فی الولی۔ وصحیح سنن ابن ماجه' کتاب النکاح' باب لا نکاح الا بولی۔

(٤) موطا الامام مالك' کتاب النکاح' باب عن سعید بن المسیب انه قال قال عمر بن الخطاب لا تنکح المرأة.....

''عورت کا نکاح اس کے ولی (باپ یا قریبی عزیز) یا خاندان کے کسی بڑے سمجھدار یا حاکمِ وقت کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے''۔

۳) ولی کی ولایت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کا اہل ہو۔ یعنی ولی کے لیے مرد، بالغ، عاقل، معاملہ فہم اور آزاد ہونا ضروری ہے۔

۴) اگر لڑکی کنواری ہو اور ولی باپ ہو تو لڑکی سے اجازت حاصل کرے کہ فلاں کے ساتھ اس کا نکاح کرنا چاہتا ہے۔ اور باپ اگر اس کے سامنے بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کے نکاح کا تذکرہ کرے اور وہ جواباً خاموشی اختیار کرے تو یہی اس کی اجازت ہے۔ اس کے برعکس اگر لڑکی بیوہ ہو یا ولی غیر باپ ہو تو وہ صریح الفاظ میں اس کی رائے حاصل کرے۔ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((اَلْاَیِّمُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِیِّهَا ' وَالْبِکْرُ تُسْتَاْذَنُ فِیْ نَفْسِهَا' وَاِذْنُهَا صُمَاتُهَا))(۱)

''بیوہ اپنے نفس کے بارے میں اپنے ولی سے زیادہ حق دار ہے، جبکہ کنواری سے اس کی ذات کے بارے میں اجازت طلب کی جائے گی اور اس کی خاموشی ہی اس کی اجازت ہے''۔

۵) اگر خدانخواستہ بچی اور اس کے ولی کے درمیان نکاح کے بارے میں اختلاف ہو جائے تو جس کا موقف دینی مصلحت پر مبنی ہو گا اس کو ترجیح دی جائے گی۔ اگر ولی اپنے غلط موقف پر ڈٹا ہوا ہے اور بچی کی شادی ایسی جگہ کرنا چاہتا ہے جو اُس کے لیے بالکل بھی مناسب نہ ہو تو خاندان کا کوئی بڑا یا عدالت ولی بن کر اس بچی کا نکاح کرائے گی۔ اور اگر بچی کا موقف دینی نقطۂ نظر سے غلط ہو تو اُس کی بات نہیں مانی جائے گی۔

کورٹ میرج اور اس کی شرعی حیثیت:

ایسی لڑکیاں جو کہ اپنے آشناؤں کے ساتھ گھر سے بھاگ جاتی ہیں اور کورٹ میرج کر لیتی ہیں، کبیرہ گناہ کی مرتکب ہوتی ہیں۔ ایسا نکاح جمہور علماء کے نزدیک باطل جبکہ احناف کے ہاں فاسد ہے۔ مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ ایسی لڑکیاں گھر سے بھاگ کر والدین کی بدنامی و رسوائی کا باعث بنتی ہیں۔ وہ ساری عمر کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ اکثر ایسی شادیوں میں جب دو چار دن بعد عشق کا نشہ ہرن ہوتا ہے تو لڑکی کے ہاتھ سوائے ذلت و رسوائی کے کچھ نہیں آتا، اور روزمرہ کے لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے طلاق تک نوبت آ جاتی ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ عورت میں اس بات کی صلاحیت و استعداد موجود نہیں ہوتی کہ وہ اپنا جیون

(۱) موطا الامام مالك، كتاب النكاح، باب استئذان البكر والايم فى انفسهما

ساتھی خود منتخب کر سکے۔ وہ عموماً مرد کے دھوکے میں آ جاتی ہے اور ایک اجنبی مرد کی خاطر اپنے محسنین، بہن بھائیوں حتیٰ کہ والدین تک کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اسی لیے شریعت نے نکاح کے معاملے میں عورت کے لیے ولی کو لازم قرار دیا ہے، مبادا عورت اپنے جذبات میں کوئی غلط فیصلہ کر کے اپنی زندگی تباہ و برباد کر لے۔ اگر باپ کی طرف سے کوئی کوتاہی ہو رہی ہو، وہ اپنی بچیوں کی شادیوں میں تأخیر سے کام لے رہا ہو یا اُن کے رشتے کسی مناسب جگہ پر طے نہ کر رہا ہو تو ایسی صورت حال میں ولایت خود بخود سب سے قریبی عزیز یا خاندان کے کسی دوسرے بڑے اور سمجھدار بزرگ کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، تا کہ بچیوں پر ظلم نہ ہو۔

(۲) دو گواہوں کی موجودگی: نکاح کے موقع پر کم از کم دو عادل گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ عادل سے مراد یہ ہے کہ وہ کبیرہ گناہ کے مرتکب نہ ہوں اور اکثر صغیرہ گناہوں سے بھی اجتناب کرتے ہوں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَشۡهِدُوۡا ذَوَیۡ عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ﴾ (الطلاق:۲)

''اور اپنوں میں سے دو عادل افراد کو گواہ بنا لو۔''

گناہ کبیرہ کے مرتکب افراد عادل نہیں ہیں، لہٰذا مذکورہ آیۂ مبارکہ کی روشنی میں زانی، شرابی یا سود کھانے والا گواہ نہیں بن سکتے۔ یہ آیۂ مبارکہ اگرچہ طلاق کے باب میں نازل ہوئی ہے، لیکن نکاح کے معاملے کو بھی اسی پر قیاس کیا گیا ہے۔ دورِ حاضر میں چونکہ عدالت کی صفات کے حاملین افراد کی کمی ہے اس لیے مجلس نکاح میں زیادہ سے زیادہ افراد ہونے چاہئیں۔ گواہوں کی عدم موجودگی میں کیا جانے والا نکاح صحیح نہ ہوگا۔

(۳) حق مہر: نکاحِ صحیح کے لیے تیسری شرط ''مہر'' کی ہے۔ عورت کو حلال کرنے کے لیے خاوند جو مال دیتا ہے وہ ''مہر'' کہلاتا ہے۔ مہر کا ادا کرنا واجب اور فرض ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً﴾ (النساء:٤)

''اور عورتوں کو اُن کے مہر خوشی سے ادا کرو''۔

حضور اکرم ﷺ نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو نکاح کے موقع پر فرمایا:

((اُنْظُرْ وَلَوْ خَاتَمًا مِنْ حَدِيْدٍ))(۱)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب النظر الی المراة قبل التزویج۔ وصحیح مسلم، کتاب النکاح، باب فی الصداق وجواز کونه تعلیم القرآن وخاتم حدید۔

''مہر کے لیے کچھ تلاش کرو چاہے لوہے کی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔''

مہر کی دو اقسام ہیں:

(۱) مہر معجّل: اگر مہر عقدِ نکاح کے وقت ہی ادا کر دیا جائے تو ''معجّل'' کہلاتا ہے۔

(۲) مہر مؤجل: اگر مہر کا کُل یا کچھ حصہ تأخیر کے ساتھ ادا کیا جائے تو وہ ''مؤجل'' کہلاتا ہے۔

مہر کتنا ہونا چاہیے' اس کی شریعت میں کوئی حد مقرر نہیں ہے' لیکن مہر میں تخفیف مستحب ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((اِنَّ اَعْظَمَ النِّکَاحِ بَرَکَةً اَیْسَرُهُ مُؤْنَةً)) (۱)

''وہ نکاح سب سے زیادہ بابرکت ہے جو آسان ترین ہو''۔

ہمارے ہاں عام طور پر مرد حضرات عورتوں کا حق مہر ادا نہیں کرتے۔ نکاح کے موقع پر زیادہ مہر لکھوا لیا جاتا ہے جو کہ بعد میں خاوند کے لیے ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اب بیوی دباؤ کی وجہ سے خاوند سے اس کا مطالبہ بھی نہیں کرتی۔ اور اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے اس کا مطالبہ کرے تو اس کو اخلاقاً برا سمجھا جاتا ہے' حالانکہ یہ تصور بالکل غلط ہے۔ مہر خاوند کے ذمہ قرض ہے اور واجب الادا ہے۔ اگر وہ اپنی زندگی میں ادا نہ کرے گا تو گناہ گار ہوگا اور اس کی وفات کے بعد اس کے ترکے میں سے عورت کو حق مہر ادا کیا جائے گا۔ ہاں اگر بیوی بغیر کسی دباؤ کے حق مہر میں سے اپنے خاوند کو کچھ معاف کر دے تو اس کی گنجائش ہے۔ لیکن ہمارے ہاں صورتِ حال یہ ہے کہ عورتوں کو عموماً اندازہ ہوتا ہے کہ خاوند نے مہر ادا تو کرنا نہیں ہے اس لیے وہ معاف کرنے میں ہی عافیت سمجھتی ہیں۔

(۴) ایجاب وقبول: ایجاب وقبول بھی نکاح کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ ایجاب کے معنی واجب کرنے کے ہیں اور قبول کے معنی قبول کرنے کے ہیں۔ لڑکی کا ولی ایجاب کرتا ہے جبکہ لڑکا اس کو قبول کرتا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لڑکی کا ولی کس چیز کا ایجاب کرتا ہے' یعنی کس چیز کو واجب کرتا ہے؟ دراصل ولایت ایک ذمہ داری ہے۔ نکاح سے پہلے لڑکی کے نان ونفقہ اور دیگر معاملات کا شرعی ذمہ دار اُس کا ولی (باپ) ہوتا ہے۔ نکاح کے موقع پر ولی (باپ) یہ ذمہ داری اس کے ہونے والے خاوند کو سونپ دیتا ہے۔ اگر وہ اس ذمہ داری کو قبول کر لے تو نکاح ہو جاتا ہے۔

---

(۱) مسند احمد' الامام احمد بن حنبل ۸۲/۶' دار احیاء التراث العربی بیروت۔

ایجاب وقبول سے متعلق مسائل اور بدعات ورسومات:

۱) ایجاب وقبول کے لیے لڑکی کا ہونا ضروری نہیں ہے اور نہ ہی ایجاب وقبول کے موقع پر لڑکی کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔

۲) ولی (جو کہ عموماً لڑکی کا باپ ہوتا ہے) لڑکی سے اس کے نکاح کے بارے میں پہلے سے ہی اجازت لے لیتا ہے' لہٰذا ایجاب وقبول کے موقع پر لڑکی کی طرف سے ایجاب اس کا ولی کرتا ہے' جبکہ قبولیت کے لیے لڑکے کا ہونا ضروری ہے۔ باپ کی عدم موجودگی کی صورت میں ولی کو چاہیے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں نکاح سے پہلے ہی لڑکی سے اجازت لے لے۔

بعض دیہی علاقوں میں دیکھنے میں آیا ہے کہ شادی کے موقع پر مولوی صاحب لڑکی سے اس کی رضامندی پوچھنے کے لیے اس کے پاس چلے جاتے ہیں اور اس بہانے دلہن کا دیدار بھی کر آتے ہیں۔ یہ ایک خلافِ شریعت فعل ہے۔ مولوی صاحب کو لڑکی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے' بلکہ لڑکی کا ولی اس کے قائم مقام ہوتا ہے' لہٰذا اس کی اجازت ہی لڑکی کی اجازت شمار ہوتی ہے۔

بڑے شہروں میں جہاں شادی کی محافل عموماً بڑے بڑے شادی ہالوں میں منعقد ہوتی ہیں وہاں نکاح کے وقت لڑکا اور لڑکی سٹیج پر ایک ساتھ ہوتے ہیں' جبکہ لڑکی کی بے پردگی ہو رہی ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک ایسی رسم ہے جو کہ اسلامی معاشرت کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔

نکاح کی جگہ اور وقت کا تعین:

نکاح کے لیے شریعت میں کوئی وقت اور جگہ متعین نہیں ہے۔ ماہِ محرم میں نکاح کو بعض لوگ ناپسند کرتے ہیں' حالانکہ شریعت میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جو کہ ماہِ محرم میں نکاح کی ممانعت کو بیان کرے۔ لہٰذا کسی بھی مہینے میں دن یا رات کے کسی بھی وقت نکاح کیا جاسکتا ہے۔

مسجد میں نکاح کی شرعی حیثیت اور اس کے فوائد:

نکاح کی جگہ کے بارے میں حضور ﷺ سے ایک روایت ہے:

((اَعْلِنُوْا هٰذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ)) (۱)

''نکاح کا علان عام کیا کرو اور اس کو مسجدوں میں منعقد کرو''۔

(۱) جامع الترمذی' کتاب النکاح' باب اعلان النکاح۔

یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے [1] لیکن اگر غور کیا جائے تو مسجد میں محفل نکاح کے منعقد ہونے میں بہت سارے فوائد ہیں۔ چونکہ مسجد ایک بابرکت جگہ ہے لہٰذا ایسی محافل کے انعقاد کے لیے موزوں ترین ہے۔ علاوہ ازیں مسجد میں نکاح کے انعقاد سے اس موقع پر ہونے والی بہت ساری خرافات مثلاً گانا بجانا، سگریٹ نوشی، ویڈیو بنوانا، مخلوط معاشرت اور رقص و سرود کی محفلوں سے بچا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے مسجد کا ہونا اگرچہ نکاح کے لیے شرط تو نہیں ہے لیکن بہتر و احسن ضرور ہے۔

نکاح کا طریقہ کار

جب لڑکے اور لڑکی والوں کے درمیان نکاح کے لیے ایک وقت اور جگہ مقرر ہو جاتی ہے تو اس موقع پر فریقین کی طرف سے رشتہ دار اور دوست احباب اکٹھے ہوتے ہیں۔ لڑکی کی طرف سے اس کا ولی حاضر ہوتا ہے جبکہ لڑکا بذاتِ خود موجود ہوتا ہے۔ کوئی بھی عالم (ہمارے ہاں عرف میں عموماً لڑکی والے اس کا تعین کرتے ہیں) خطبۂ نکاح پڑھتا ہے جو کہ مسنون ہے۔ اس کے الفاظ کچھ اختلاف کے ساتھ مختلف روایات اور احادیث کی کتب میں مل جاتے ہیں۔ اس کے بعد لڑکی کے ولی سے وہ عالم اجازت لیتا ہے اور اس کا نکاح مقررشدہ مہر کے عوض اس کے ہونے والے خاوند سے کر دیتا ہے۔

نکاح کے موقع پر بعض رسومات اور ان کا شرعی حکم

i) نکاح کے موقع پر لڑکے سے چھ کلمے پڑھوانا، جیسا کہ عموماً دیہاتوں میں رواج ہے، ایک غیر شرعی رسم ہے۔ اسلام کا کلمہ تو ایک ہی ہے، اور وہ کلمۂ شہادت ہے۔ نکاح کے موقع پر تجدیدِ اسلام کی اس رسم کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر لڑکے کے بارے میں یہ ظن یا گمان ہو کہ اس کو کلمۂ شہادت تک صحیح نہ آتا ہوگا تو ایسی صورت میں اس سے کلمۂ شہادت پڑھوا لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ii) نکاح کے موقع پر چھوہارے وغیرہ تقسیم کرنا یا بانٹنا مسلمانوں کے ہاں عرفاً ثابت ہے، اس لیے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ایسی رسم یا رواج جو کہ خلاف شرع نہ ہو، جائز ہے۔

iii) اگر کچھ بھانڈ یا میراثی وغیرہ اکٹھے ہو جائیں تو ان کو بھگا دینا چاہیے۔ عموماً یہ لوگ فحش لطیفوں

---

(۱) سبل السلام، علامة محمد بن اسماعیل الصنعانی، جلد۳، ص ۱۱٦، مطبعة احیاء التراث العربی، بیروت۔ تحفة الاحوذی، علامة عبدالرحمن مبارکپوری، ج۲، ص ۱۷۰، مطبعة نشر السنة ملتان۔

اور گانوں کے ذریعے لوگوں کو محظوظ کر کے پیسے بٹورتے ہیں جو کہ ایک حرام کام ہے۔

iv) دولہا کو پیسوں کے ہار وغیرہ پہنانا شرعاً ناجائز ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔ ہاں پھولوں کے ہار پہنائے جاسکتے ہیں۔

v) نکاح کے دن دولہا کا مقامی دربار پر جا کر حاضری دینا اور اس کا طواف کرنا ایک مشرکانہ عمل ہے، جبکہ مقامی مسجد کی زیارت کر کے اس میں دو رکعت نفل نماز ادا کرنا سنت سے ثابت نہیں ہے۔

vi) دولہا کا کُلہ یا دستار پہننا، مخصوص لباس پہننا یا گھوڑی چڑھنا، یہ ہمارے معاشرے کے ایسے رواجات ہیں جن کے جائز ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ اِن کا تعلق عرف سے ہے۔

رسم ورواج (عرف) کے بارے میں چند اصول وضوابط

یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر ہونے والی ہر رسم کو ہم بدعت یا حرام نہیں قرار دے سکتے۔ کسی رسم ورواج کے جائز ہونے کی کیا شرائط ہیں، فقہاء نے اصول کی کتابوں میں اِن پر تفصیلاً بحث کی ہے۔ ذیل میں ہم ان کا خلاصہ پیش کیے دیتے ہیں۔ ایک رواج اس صورت میں جائز ہوگا جبکہ اس میں درج ذیل شرائط پائی جائیں:

۱) رواج نص کے مخالف نہ ہو۔ مثلاً شادی کے موقع پر ویڈیو بنوانا یا مخلوط معاشرت اور رقص و سرود کی محفلیں سجانا وغیرہ۔

۲) رواج مطرد اور غالب ہو۔ یعنی کوئی رواج لوگوں میں عام یا مشہور ہو اور اس سے متعلق طبقہ کے لوگ اس سے واقف ہوں، ایسا نہ ہو کہ کوئی واقف نہ ہو۔ غالب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ رواج اکثر جگہوں پر پایا جاتا ہو اور اکثر ایسا ہی رواج ہو، بہت کم اس کے خلاف کوئی دوسرا طریقہ ملتا ہو۔

۳) وہ رواج جس پر کسی معاملے یا تصرف کو محمول کیا جائے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس معاملے کے وقت موجود ہو، یعنی عرف اس معاملے سے پہلے وجود میں آیا ہو۔

۴) کوئی ایسا قول یا فعل موجود نہ ہو جو کہ رواج کے خلاف ہو۔ (۱)

۵) اس رسم یا رواج میں غیر مسلم اقوام کی مشابہت نہ ہو۔ جیسے مہندی کی رسم

بہرحال ان شرائط خمسہ کی روشنی میں مسلمان معاشرے میں کسی بھی معروف رواج کی شرعی حیثیت کو ہم متعین کر سکتے ہیں۔

---

(۱) جامع الاصول، ڈاکٹر احمد حسن، اردو ترجمہ "الوجیز فی اصول الفقہ" ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، مطبع مجتبائی پاکستان لاہور، ص ۴۰۰ تا ۴۰۲۔